# الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

ISSN 0970-180X

پھول سے آپ کانٹے کو جدا نہیں کر سکتے
خواہ آپ اس کے خلاف
کتنا زیادہ احتجاج کریں
خواہ آپ اس کے اوپر بلڈوزر چلا دیں

نومبر ۱۹۸۹
شمارہ ۱۵۶

# تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ۔ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۲۵ روپیہ

جلد دوم ۱۲۵ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

# الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۵۶ نومبر ۱۹۸۹

## فہرست


| | صفحہ | | صفحہ |
|---|---|---|---|
| حوصلہ مندی | ۲ | قومی اتحاد | ۱۰ |
| انشاء اللہ | ۳ | جنگ اور امن | ۱۷ |
| چپ رہیے | ۴ | حضرت عمر بن عبد العزیز | ۲۵ |
| عبادت گاہ | ۵ | دعوت اور عمل | ۲۷ |
| ٹارچ کے بغیر | ۶ | عبرت ناک | ۲۹ |
| ترتیب کار | ۷ | ایک سفر — پہلی قسط | ۳۱ |
| پیغمبر کا طریقہ | ۸ | خبر نامہ اسلامی مرکز | ۴۱ |
| ایک حقیقت | ۹ | شرائط ایجنسی الرسالہ | ۴۸ |


ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ فون: 697333. 611128

# حوصلہ مندی

سر سی وی رمن (۱۹۷۰ - ۱۸۸۸) ایک مشہور ہندستانی سائنس داں ہیں۔ انھوں نے روشنی کی سائنس میں ایک نیا اصول دریافت کیا جو انھیں کے نام پر رمن ایفکٹ Raman Effect کہا جاتا ہے۔ اسی دریافت کی بنا پر انھیں ۱۹۳۰ میں فزکس کا نوبیل انعام دیا گیا۔

رمن تمل ناڈو کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے انتہائی محنت کے ساتھ پڑھا۔ یہاں تک کہ بی ایس سی اور ایم ایس سی میں انھوں نے مدراس یونیورسٹی میں ٹاپ کیا۔ وہ نہایت حوصلہ مند آدمی تھے، انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر سر آسوتوش مکرجی کے سامنے یہ عہد کیا کہ میں نوبیل انعام کو نہر سوئز کے مشرق میں لے آؤں گا:

I will bring the Nobel prize east of the Suez.

اس عہد کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے بے پناہ محنت شروع کی۔ تاہم ریسرچ کی آسانیاں انھیں حاصل نہ تھیں۔ معاشی ضرورت کے تحت انھوں نے کلکتہ میں ایک سرکاری ملازمت کرلی تھی۔ ایک روز وہ ٹرام کے ذریعہ بوبازار (کلکتہ) سے گزر رہے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک عمارت پر حسب ذیل الفاظ کا ایک بورڈ لگا ہوا ہے:

The Indian Association for the Cultivision of Science

یہ بورڈ دیکھ کر وہ چلتی ٹرام سے کود پڑے۔ اس ادارہ میں جاکر معلومات کیں۔ پتہ چلا کہ یہاں ریسرچ کی سہولتیں موجود ہیں۔ اس کے بعد وہ صبح سویرے وہاں پہونچ جاتے اور آفس کے وقت تک مسلسل اپنے تحقیق اور تجربے میں لگے رہتے۔ اسی طرح شام کو آفس سے چھٹی پاتے ہی دوبارہ وہاں پہونچ جاتے اور رات تک وہاں مشغول رہتے۔ اس طرح پندرہ سال کی مسلسل محنت سے انھوں نے وہ سائنسی قانون دریافت کیا جس پر انھیں دنیا کا معزز ترین علمی انعام (نوبیل پرائز) دیا گیا۔

رمن کو یہ دھن تھی کہ وہ نوبیل انعام کو سوئز کے مشرق میں لے آئیں اور وہ اس کو لے آئے۔ مگر آج خدا کے بندوں میں کوئی نہیں جو اس لیے تڑپ اٹھا ہو کہ وہ خدا کے دین کو سوئز کے مغرب میں لے جائے گا۔ خدا کا دین "سوئز" کو پار کرنے کے لیے آج بھی کسی حوصلہ مند کا انتظار کر رہا ہے۔

# انشاء اللہ

اسلام کی تعلیمات میں سے ایک تعلیم یہ ہے کہ آدمی جب کسی کام کے بارے میں اپنے ارادہ کا اظہار کرے تو اس کے ساتھ انشاء اللہ (اگر اللہ نے چاہا) بھی ضرور کہے۔ مثلاً ایک شخص دہلی سے بمبئی جانے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اس طرح نہ کہے کہ کل میں بمبئی جاؤں گا، بلکہ یوں کہے کہ: انشاء اللہ کل میں بمبئی جاؤں گا۔

یہ کلمہ گویا اس حقیقت واقعہ کا اعتراف ہے کہ میری چاہ صرف اس وقت پوری ہوگی جب کہ اللہ کی چاہ بھی اس میں شامل ہو جائے۔ یہ اپنے چاہنے میں اللہ کے چاہنے کو ملانا ہے، اپنے ارادے کے ساتھ اللہ کے ارادے کو شامل کرنا ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان ارادہ کرتا ہے اور اس کے مطابق کوشش کرتا ہے۔ مگر کسی کوشش کی تکمیل صرف اس وقت ممکن ہوتی ہے جب کہ اس کے ساتھ اللہ کی رضامندی بھی شامل ہو جائے۔ اسی کو عربی میں اس طرح کہا گیا ہے کہ کوشش میری طرف سے ہے اور اس کی تکمیل اللہ کی طرف سے (السعی منّی والاتمام من اللّٰہ)

اس اعتبار سے خدا اور بندے کا معاملہ گویا دندانہ دار پہیہ Cog wheel کا معاملہ ہے۔ ایک پہیہ خدا کا ہے اور دوسرا پہیہ انسان کا۔ جب دونوں کے دندانے ایک دوسرے میں مل جاتے ہیں، اس کے بعد زندگی کی مشین چل پڑتی ہے۔ انسان اگر ایسا کرے کہ خدا کے پہیہ سے الگ ہو کر اپنا پہیہ چلانا چاہے تو بظاہر حرکت کے باوجود وہ بے فائدہ ہوگا۔ کیوں کہ پوری مشین کے چلنے کے لیے ضروری تھا کہ خدا کے پہیہ کا دندانہ بھی انسان کے پہیہ کے ساتھ شامل ہو۔

انشاء اللہ کا کلمہ، باعتبار حقیقت، ایک دعا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے کام کا آغاز کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتا ہے کہ وہ انسان کے کاگ میں اپنا کاگ ملا دے تاکہ زندگی کی مشین چل پڑے اور اپنے مطلوبہ انجام تک پہونچے۔ انشاء اللہ کہنا گویا زندگی کے سفر میں مالک کائنات کو اپنے ساتھ لینا ہے۔ اور جس آدمی کا یہ حال ہو کہ خود مالک کائنات اس کا ہم سفر ہو جائے۔ اس کو منزل تک پہونچنے سے کون روک سکتا ہے۔

# چپ رہیے

قرآن میں ہے کہ کان اور آنکھ اور دل، ہر چیز کے بارہ میں انسان سے پوچھ ہوگی (بنی اسرائیل ۳۶)

حدیث میں آیا ہے کہ تم میں جو شخص فتویٰ دینے میں زیادہ جری ہے وہ جہنم کے اوپر زیادہ جری ہے (اجرؤکم علی الفتویٰ اجرؤکم علی النار)

اس بنا پر صحابہ کرام فتویٰ دینے میں انتہائی احتیاط برتتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ عبداللہ ترازو میں اُحد پہاڑ سے بھی زیادہ وزنی ہیں۔ (عبد اللہ اثقل فی المیزان من احد) اس کے باوجود ان کا یہ حال تھا کہ وہ کوفہ میں تھے۔ ان سے ایک معاملہ میں پوچھا گیا تو انھوں نے جواب نہیں دیا۔ لوگ ان سے مہینہ بھر پوچھتے رہے۔ یہاں تک کہا کہ اگر آپ ہی فتویٰ نہ دیں تو ہم کس سے پوچھیں۔ پھر بھی انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا (فی سنن ابی داؤد ان ابن مسعود کان فی الکوفۃ فسئل عن امر فلم یجب۔ فاختلفوا الیہ شھراً ولم یجب۔ وفی روایۃ: من نسأل اذا لم نسألک)

حضرت عبداللہ بن عمر ہمیشہ فتویٰ دینے سے پرہیز کرتے تھے۔ لوگ جب زیادہ اصرار کرتے تو کہتے کہ ہماری پیٹھ کو جہنم کے لیے سواری نہ بناؤ (لا تجعلوا ظھورنا مطایا الی جھنم)

ان روایات میں فتویٰ سے مراد کوئی محدود فتویٰ نہیں ہے۔ اس کا تعلق ان تمام امور سے ہے جو مسلمانوں کو پیش آتے ہیں اور جن میں وہ اپنے علماء اور اپنے رہنماؤں سے رائے پوچھتے ہیں۔ ایسے امور میں علماء اور رہنماؤں کا فرض ہے کہ وہ بولنے سے زیادہ سوچیں۔ وہ اس وقت تک کوئی بیان نہ دیں جب تک اس معاملہ میں مشورہ اور مطالعہ اور غور وفکر کی تمام شرطوں کو آخری حد تک پورا نہ کر چکے ہوں۔ ایسے امور میں نہ بولنا اس سے بہتر ہے کہ آدمی غیر ذمہ دارانہ طور پر بولنے لگے۔

اجتماعی معاملات میں رائے دینا انتہائی نازک ذمہ داری ہے، کیوں کہ اگر رائے غلط ہو تو لوگوں کو نامعلوم مدت تک اس کا نقصان بھگتنا پڑتا ہے۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ اگر وہ بولنا چاہتا ہے تو پہلے اس کی تمام شرطوں کو پورا کرے، اس کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرے۔

# عبادت گاہ

ڈاکٹر رالف سسن Ralph R. Sisson اسٹیٹ یونیورسٹی آف نیویارک (امریکہ) میں کمیونی کیشن کے پروفیسر ہیں۔ ۲۷ جنوری ۱۹۸۹ کو ان سے اسلامی مرکز میں تفصیلی ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں میں نے انھیں اسلام کے تصور توحید، تصور رسالت اور تصور آخرت سے متعارف کیا۔ گفتگو کے دوران میں نے ان سے پوچھا کہ آپ ایک عیسائی خاندان میں پیدا ہوئے۔ کیا آپ چرچ جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پہلے جاتا تھا، مگر اب نہیں جاتا۔ اس کی وجہ بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ چرچ کے اندر بڑا عجیب ماحول ہوتا ہے۔ نقش و نگار، موسیقی، مختلف آوازیں اور طرح طرح کے رسمی اعمال۔ مجھ کو تو چرچ عبادت گاہ کے بجائے ایک کلب جیسا معلوم ہوتا ہے:

It looks like a club, not a place of worship

امریکی پروفیسر نے جو بات چرچ کے بارہ میں کہی، وہی تمام دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کے لیے صحیح ہے۔ موجودہ زمانہ میں مذہبی بگاڑ نے تمام دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کا ماحول ایسا بنا رکھا ہے کہ وہ عبادت گاہ کے بجائے کلب کے مشابہ ہو گیے ہیں۔ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کے مقابلہ میں اسلامی مسجد انتہائی سادہ ہوتی ہے۔ اسلامی مسجدیں واقعی عبادت گاہ نظر آتی ہیں۔ جب کہ دوسری عبادت گاہیں اپنے ظاہری حلیہ کے اعتبار سے کلب دکھائی دیتی ہیں۔ مساجد کی اس سادگی اور ان کے اندر فطری عبادت کے ماحول نے ان مساجد کو ایک قسم کی زندہ تبلیغ بنا دیا ہے۔ ان کو دیکھنا بذات خود اپنے اندر ایک تاثیری طاقت رکھتا ہے۔ مسجد اپنی ذات میں اسلام کی تبلیغ ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں دعوتی جذبہ نہ ہونے کا یہ نتیجہ ہے کہ انھوں نے اپنی مسجدوں کے دروازے غیر مسلموں کے اوپر بند کر رکھے ہیں۔ اگر کسی تاریخی مسجد میں سیاحوں کو داخلہ کی اجازت ہو تو وہاں بھی نماز کے وقت انھیں باہر کر دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی مسجدوں کے دروازے غیر مسلموں کے لیے آزادانہ طور پر کھول دیں۔ یہ واقعہ انشاء اللہ غیر مسلموں کے دل کے دروازے کھولنے کا ذریعہ بن جائے گا۔

# ٹارچ کے بغیر

گاؤں کا ایک شخص اندھیری رات میں چل رہا تھا۔ کھیتوں کی پگڈنڈی پار کرتے ہوئے اچانک اس کو محسوس ہوا کہ کوئی چیز اس کے پیروں میں پھنس رہی ہے۔ اس نے حیرت اور خوف کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ چھلانگ لگائی۔ اگلے لمحہ اس کی انگلیاں ٹارچ کے سوئچ پر پہونچ چکی تھیں۔ ٹارچ روشن ہوئی تو نظر آیا کہ اس کے دائیں طرف ایک سانپ خشمگیں نظروں سے اس کو دیکھ رہا ہے۔

آدمی کے پاس ٹارچ تھی۔ مگر وہ اس کو جلائے بغیر اپنا سفر طے کر رہا تھا۔ اس بنا پر اس کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا۔ ٹارچ اگر روشن ہوتی تو راستہ میں سانپ کی موجودگی کا اس کو پہلے ہی علم ہو جاتا۔ مگر ٹارچ روشن نہ کرنے کی وجہ سے سانپ کی موجودگی کا علم اس کو صرف اس وقت ہوا جب کہ وہ اس کو کاٹ چکا تھا۔

یہی حالت ایک اور اعتبار سے موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی ہے۔ مسلمانوں کے پاس خدا کی کتاب ہے۔ مگر وہ اس سے اپنے معاملات میں ہدایت حاصل نہیں کرتے۔ وہ خدائی ٹارچ کو روشن کیے بغیر زندگی کا راستہ طے کر رہے ہیں۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ قدم قدم پر ٹھوکروں سے دوچار ہوتے ہیں۔

مثلاً خوف کی ایک صورت مسلمانوں کے سامنے آتی ہے۔ مسلمان اس کو اغیار کا مسئلہ سمجھ کر ان کے خلاف لاحاصل شور و غل شروع کر دیتے ہیں۔ اگر وہ قرآن کی ٹارچ جلائے ہوئے ہوں تو انھیں فوراً یہ معلوم ہو جائے گا کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اغیار کی حیثیت سے محفوظ کر دیا ہے۔ اب ان کے لیے صرف حیثیتِ خداوندی کا مسئلہ ہے نہ کہ حیثیتِ انسانی کا۔ (المائدہ ۳)

اسی طرح ایک گروہ مسلمانوں کے خلاف فساد کرتا ہے اور ان کو نقصان پہونچاتا ہے۔ یہاں بھی مسلمان یہی کرتے ہیں کہ دوسروں کے خلاف تیز و تند الفاظ بول کر اپنے دل کی بھڑاس نکالنے لگتے ہیں۔ اگر وہ قرآن کی ٹارچ روشن کر کے دیکھیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ اس قسم کا شور و غل بے فائدہ ہے۔ کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ اپنا داخلی جائزہ لیا جائے اور اپنی اندرونی کمزوریوں کا پتہ کر کے ان کی اصلاح کی جائے (آل عمران ۱۵۲، التوبہ ۲۵)

# ترتیب کار

صحیح بخاری (باب تالیف القرآن) میں حضرت عائشہ کی ایک روایت نقل ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ قرآن میں پہلے وہ آیتیں اتریں جن میں جنت اور جہنم کا ذکر ہے۔ یہاں تک کہ جب لوگوں کے ذہن اسلامی قانون کے لیے تیار ہو گیے، اس وقت قرآن میں حلال وحرام کی آیتیں اتریں۔ اگر قرآن میں پہلے ہی یہ اترتا کہ شراب نہ پیو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی شراب نہ چھوڑیں گے۔ اور اگر پہلے ہی یہ اترتا کہ زنا نہ کرو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم زنا نہ چھوڑیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی تحریک کے دو بڑے مرحلے ہیں۔ ایک، مرحلۂ دعوت۔ اور دوسرا، مرحلۂ نفاذِ احکام۔ اسلامی عمل کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے دعوتی جدوجہد کے ذریعہ لوگوں کا ذہن بنایا جائے۔ ان کے دلوں میں آمادگی پیدا کی جائے۔ جب یہ ابتدائی کام ہو چکا ہو اس وقت انھیں حلال وحرام کے عملی احکام سنائے جائیں اور حسب مقدور ان کی تعمیل کی جائے۔

اسلامی عمل کی یہ ترتیب غیر مسلم اقوام کے لیے بھی مطلوب ہے اور مسلم معاشروں کے لیے بھی۔ غیر مسلم اقوام تک اسلام کا پیغام پہنچانا فرض کے درجہ میں مطلوب ہے۔ مگر یہ ایک مرحلہ دار کام ہے۔ نہ کہ کوئی یکبارگی عمل۔ اوّلاً اسلام کی بنیادی تعلیمات کو ان کے سامنے موثر انداز میں پیش کیا جائے گا۔ جب یہ کام قابل لحاظ حد تک انجام پا جائے، اس کے بعد وہ اسلام کے عملی قوانین کے مخاطب بنائے جائیں گے۔

یہی معاملہ مسلمانوں کا بھی ہے۔ تاریخی تجربہ بتاتا ہے اور قرآن سے ثابت ہے کہ مسلمانوں کی بعد کی نسلیں ایمانی کمزوری، یا قرآن کے لفظ میں قساوت (الحدید ۱۶) کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس وقت مسلمانوں میں از سر نو اسلامی زندگی پیدا کرنے کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ان پر دوبارہ وہی عمل کیا جائے جو دور اول میں کیا گیا تھا۔ یعنی پہلے ان کے اندر دعوتی جدوجہد کے ذریعہ اسلامی ذہن بنانا، اس کے بعد حالات کے مطابق ان کے اوپر اسلام کے عملی قوانین کا نفاذ۔

اس ترتیب وتدریج کے بغیر کوئی بھی نتیجہ خیز کام نہیں کیا جا سکتا۔

# پیغمبر کا طریقہ

سیرت رسول کے مشہور راوی ابن اسحاق کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی قوم کے سامنے اسلام کا اظہار کیا اور کھلم کھلا اس کا اعلان فرمایا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا تھا تو آپ کی قوم نے آپ سے دوری اختیار نہ کی اور نہ انھوں نے آپ کا انکار کیا۔

یہاں تک کہ آپ نے ان کے بتوں کا ذکر کیا اور ان پر عیب لگائے۔ جب آپ نے ایسا کیا تو انھوں نے آپ کے معاملہ کو اہمیت دی اور آپ سے اجنبیت برتنے لگے۔ وہ آپ کی مخالفت اور دشمنی پر متحد ہو گیے۔ سوا ان لوگوں کے جنھیں اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعہ بچا لیا۔ ایسے لوگ تھوڑے تھے اور چھپے ہوئے تھے:

فلما بادی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قومہ بالاسلام وصدع بہ کما امرہ اللہ لم یبعد منہ قومہ ولم یردّوا علیہ۔ حتی ذکر آلھتھم وعابھا۔ فلما فعل ذلک اعظموہ وناکروہ واجمعوا خلافہ وعداوتہ الا من عصم اللہ تعالیٰ منھم بالاسلام وھم قلیل مستخفون (سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۲۷۶-۲۷۵)

قدیم عرب کے مشرکوں کے بُت دراصل ان کے قومی اکابر تھے جن کی تصویر بنا کر وہ ان کی تعظیم اور پرستش کرتے تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب تک توحید اور اخلاق کی بات کرتے رہے، تو مشرکین نے آپ کی بات کو برا نہ مانا۔ مگر جب آپ نے غیر خداؤں کی تقدیس اور پرستش کو غلط بتایا اور مشرکین کی غیر خدا پرستانہ روش پر تنقید کی تو وہ بگڑ گیے۔ یہی ہر زمانہ کا معاملہ ہے۔ اگر لوگوں کے سامنے عمومی انداز میں صرف اخلاق اور انسانیت کی باتیں کیجئے تو ہر ایک آپ سے راضی رہے گا۔ لیکن اگر حق کی عمومی دعوت کے ساتھ لوگوں کی خلاف حق روش پر تنقید کی جائے اور ان کے اکابر کا تجزیہ کیا جانے لگے تو فوراً لوگ بپھر اٹھیں گے۔ مگر پیغمبر کا طریقہ یہی ہے کہ دعوت کے ساتھ تجزیہ بھی کیا جائے۔ نصیحت کے ساتھ تنقید بھی کی جائے۔

جو لوگ غیر خدا کو خدا کا مقام دیئے ہوئے ہوں وہی تنقید پر بپھرتے ہیں۔ جو لوگ ایک خدا کی عظمتوں میں جی رہے ہوں، وہ کسی انسان پر تنقید سے کبھی نہیں بپھریں گے۔

# ایک حقیقت

جو شخص ایک معاملہ میں غلط ثابت ہو وہ ہر معاملہ میں غلط ہے۔ اس میں صرف اس آدمی کا استثناء ہے جو غلطی کرنے کے بعد شرمندہ ہو اور کھلے دل سے اپنی غلطی کا اعتراف کرے۔

یہ ایک نفسیاتی اصول اور زندگی کی ایک اٹل حقیقت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے پورے وجود کے ساتھ ایک کُل ہے۔ انسان سے کسی غلطی کا سرزد ہونا ایسا ہی ہے جیسے گلاس سے ایک قطرہ کا باہر آنا۔ گلاس کے قطرہ کو دیکھ کر سمجھا جا سکتا ہے کہ اس کے اندر کیا چیز بھری ہوئی ہے۔ اسی طرح انسان کی ایک روش کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بقیہ اعتبار سے وہ انسان کیسا انسان ہے۔

تاہم گلاس میں اور انسان میں ایک فرق ہے۔ گلاس جامد چیز ہے، اور انسان ایک متحرک مخلوق ہے۔ انسان اس پر قادر ہے کہ غلطی کرنے کے بعد وہ اپنی اصلاح کر سکے۔ اسی کا نام توبہ ہے توبہ کی صلاحیت نے انسان کو ایک خود اصلاحی مشین بنا دیا ہے۔

انسان سے جب ایک غلطی ہو، اس وقت اگر اس کا شعور جاگ اٹھے۔ وہ کسی تحفظ کے بغیر کھلے طور پر اعتراف کرلے کہ میں نے غلطی کی تو، مشینی اصطلاح میں، گویا اس نے اپنے نقص کو درست کر لیا۔ وہ دوبارہ ایک نیا انسان بن گیا۔

غلطی کرنے کے بعد اپنی غلطی کا اعتراف نہ کرنا کوئی سادہ سی بات نہیں، یہ بے حد اہم بات ہے۔ جب آدمی اپنی غلطی کو نہیں مانتا تو اس کے پیچھے کوئی خاص سبب ہوتا ہے۔ مثلاً بڑائی کا احساس۔ ذاتی مفاد کا خطرہ۔ وغیرہ۔

اسی قسم کی ایک یا دوسری کمزوری ہوتی ہے جس کی بنا پر آدمی کھلی ہوئی غلطی کا ارتکاب کرنے کے باوجود اس کا اقرار نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں غلطی کے اقرار کو بے حد اہمیت دی گئی ہے۔ جب آدمی اپنی غلطی کا اقرار کرتا ہے تو وہ اپنے اندر چھپی ہوئی بہت سی کمزوریوں کو مٹاتا ہے۔ وہ گویا نفسیاتی معنوں میں ایک غسل صحت کرتا ہے۔ گندا انسان از سر نو ایک پاک صاف انسان بن جاتا ہے۔

یہی معاملہ برعکس صورت میں اس شخص کا ہے جو غلطی کا اعتراف نہ کرے۔ اس کی روح بدستور گندگی میں پڑے رہے گی، وہ ہمیشہ پیچھے جاتا رہے گا، روحانی میدان میں وہ آگے کی طرف سفر نہیں کر سکتا۔

# قومی اتحاد

بھارت وکاس پریشد (نئی دہلی) ۱۹۶۹ میں قائم ہوئی۔ یہ ایک تعلیمی اور ثقافتی ادارہ ہے۔ اس کے موجودہ سرپرست ڈاکٹر ایل ایم سنگھوی اور صدر جسٹس ایچ آر کھنہ ہیں۔ ۱۱-۱۲ فروری ۱۹۸۹ میں اس کی طرف سے ایک آل انڈیا سمینار ہوا۔ سمینار کی کارروائیاں کانسٹی ٹیوشن کلب (نئی دہلی) میں انجام پائیں۔ ۱۲ فروری کی شام کو "کلوزنگ سیشن" میں میرا پیپر رکھا گیا تھا۔ اس کے تحت مذکورہ سمینار میں شرکت ہوئی۔ اس سمینار کا موضوع تھا قومی اتحاد اور ہندستان کی مذہبی اقلیتیں:

National unity and religious minorities in India

۸۹ - ۱۹۸۸ کے درمیان مجھے اس قسم کے کئی سمیناروں میں شرکت کا اتفاق ہوا ہے۔ ان کا مختصر ذکر الرسالہ میں "خبرنامہ اسلامی مرکز" کے تحت دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ تمام سمینار راجدھانی دہلی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوؤں کی طرف سے کیے گئے تھے۔ اور ان میں بڑے بڑے ہندو دماغ شریک تھے۔ لوگوں کی تقریریں سننے کے بعد میرا احساس یہ تھا کہ "ہندو دماغ" ملک کی موجودہ صورت حال پر سخت تشویش میں مبتلا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ملک میں فرقہ واریت کا مسئلہ ختم ہو۔ ملک میں قومی اتحاد آئے۔ تمام فرقے اور گروہ یک جہتی کے ساتھ مثبت عمل کی راہ پر لگ جائیں کیوں کہ اس کے بغیر ملک کی حقیقی ترقی ممکن نہیں۔

## فکری سادگی

تاہم ان اجتماعات کو سننے اور دیکھنے کے بعد میرا مشترک احساس یہ تھا کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا احساس تو ضرور لوگوں کے اندر شدید طور پر پیدا ہوا ہے، مگر فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل کیا ہو، اس کے بارے میں ان کا ذہن ابھی تک واضح نہیں ہے۔ زیادہ تر لوگ سسٹم یا قانون میں تبدیلی کی بات کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مذکورہ سمینار میں یہ تجویز کیا گیا کہ ہندستان کے دستور میں جہاں اقلیتی حق (Minority right) کا لفظ لکھا ہوا ہے، وہاں اس کو بدل کر انسانی حق (Human right) کا لفظ لکھ دیا جائے۔ اقلیتی کمیشن کو ختم کرکے اس کی جگہ انسانی کمیشن مقرر کیا جائے، وغیرہ۔

اس قسم کی تجویزوں کے پیچھے یہ ذہن ہے کہ ملک میں جو گروہ بندی اور فرقہ وارانہ امتیاز ہے،

وہ اس لیے ہے کہ ہمارا دستور "اقلیتوں کے حقوق" کا لفظ بولتا ہے۔ وہ ملک میں کئی گروہ تسلیم کرکے ان کے الگ الگ حقوق مقرر کرتا ہے۔ اس سے علیحدگی کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر دستور میں "انسانی حقوق" کا لفظ درج کر دیا جائے تو ملک کے تمام لوگ ایک ہی نوع (انسان) نظر آئیں گے۔ اس کے بعد اپنے آپ علیحدگی کا ماحول ختم ہو کر یگانگت کا ماحول قائم ہو جائے گا۔

مگر یہ اصل معاملہ کو بہت سادہ سمجھنا (Oversimplification) ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل مسئلہ امر واقعہ کو بدلنے کا ہے نہ کہ کسی لفظ کو بدلنے کا۔ درخت کی دنیا میں اگر پھول کے ساتھ کانٹے بھی ہیں تو آپ کانٹوں کے مسئلہ کو اس طرح ختم نہیں کر سکتے کہ اپنی درخت کی ڈکشنری سے کانٹے کا لفظ نکال دیں، اور ہر جگہ صرف پھول ہی پھول لکھ دیں۔ درخت میں کانٹے کا مسئلہ ایک حقیقی مسئلہ ہے۔ اور ایک حقیقی مسئلہ کو حقیقی سطح پر عمل کرکے حل کیا جا سکتا ہے نہ کہ لفظی سطح پر عمل کرکے۔

مذکورہ فکر کا خلاصہ یہ ہے کہ "اقلیت" اور "اکثریت" کا لفظ امتیاز اور علیحدگی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس سے سماج میں طبقات پیدا ہوتے ہیں، اس کے برعکس اگر دستور میں "انسان" کا لفظ لکھ دیا جائے تو امتیاز کا تصور ختم ہو جائے گا اور سماج میں طبقاتی علیحدگی ختم ہو کر طبقاتی یکسانیت کا دور آجائے گا۔

مگر اس قسم کی سوچ سادہ لوحی (Naive thinking) کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندستانی سماج اور اسی طرح تمام ملکوں کے سماج میں مختلف نسلی اور مذہبی طبقات پائے جاتے ہیں۔ یہ فرق موجود ہیں اور موجود رہیں گے۔ ان کو اس طرح ختم نہیں کیا جا سکتا کہ قانون میں ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ لکھ دیا جائے۔

اس کی ایک عملی مثال ہریجن کا مسئلہ ہے۔ ہریجنوں کے سلسلہ میں وہ چیز عملاً حاصل کی جا چکی ہے جس کا مطالبہ اقلیتوں کے سلسلہ میں کیا جا رہا ہے۔ قدیم تصور کے مطابق، ہندو اونچی ذات کے لوگ ہیں اور ہریجن (شُدر) نیچی ذات کے لوگ۔ آزادی کے بعد جو قانون سازی ہوئی ہے، اس میں دونوں کو لفظی طور پر ایک کر دیا گیا ہے، چنانچہ ہمارا موجودہ دستور دونوں کو یکساں طور پر ہندو قرار دیتا ہے۔

مگر کیا اس لفظی یکسانیت کی وجہ سے ہندو (اونچی ذات) اور ہریجن (نیچی ذات) کا فرق ختم

ہوگیا۔ ہر آدمی جانتا ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ لفظی یکسانیت پیدا کرنے کے باوجود دونوں میں سماجی یکسانیت نہیں آئی، دونوں کے درمیان سابقہ تفریق بدستور پوری طرح باقی ہے۔

## سبق آموز مثال

جو لوگ فرقہ وارانہ مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں، وہ ہمیشہ ایک بنیادی غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ شمالی ہندستان کو کل ہندستان سمجھ لیتے ہیں۔ اس بنا پر ان کا تجزیہ بھی نادرست ہوتا ہے اور ان کا پیش کردہ حل بھی نادرست۔

زیر بحث مسئلہ کا ایک اہم ترین عملی پہلو یہ ہے کہ یہ ملک دو مختلف حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک شمالی ہند، اور دوسرے جنوبی ہند۔ پچھلی نصف صدی کی تاریخ بتاتی ہے کہ جتنے بھی فرقہ وارانہ جھگڑے ہوتے ہیں، وہ سب کے سب شمالی ہند میں ہوتے ہیں۔ جنوبی ہند میں اس قسم کا کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ اگر کبھی اتفاق سے کوئی فرقہ وارانہ جھگڑا جنوب کے علاقہ میں ہوا ہے، تو وہ شمالی ہند کے لوگوں ہی کا پیدا کردہ تھا جو کسی وجہ سے وہاں پہنچ گئے۔ خود جنوبی ہند کے لوگوں نے کبھی اس قسم کا کوئی جھگڑا برپا نہیں کیا۔ جب کہ وہ تمام فرقے جنوبی ہند میں بھی موجود ہیں جو شمالی ہند میں موجود ہیں۔ اور وہ تمام گروہی فرق وہاں بھی پائے جاتے ہیں، جو یہاں پائے جاتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ شمالی ہند میں ہم جس مسئلہ کو حل کرنے کی باتیں کرتے ہیں، وہ جنوبی ہند میں عملاً حل شدہ ہے، جب ایسا ہے تو سب سے پہلے ہمیں ملک کے دونوں علاقوں کے فرق کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ موجودہ صورت حال میں ہمیں اس کے سوا اور کچھ نہیں کرنا ہے کہ جنوبی ہند کو شمالی ہند تک وسیع کر دیں۔ جو کچھ ملک کے ایک حصہ میں جاری ہے، اس کو ملک کے دوسرے حصہ میں جاری کر دیں۔

راقم الحروف نے جنوبی ہند کے کئی سفر کیے ہیں اور اس مسئلہ کو تفصیل کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ میرا حاصل مطالعہ یہ ہے کہ اس فرق کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ جنوبی ہند کے لوگوں میں تحمل (Tolerance) ہے، جب کہ شمالی ہند کے لوگوں میں تحمل نہیں۔ جنوبی ہند کے لوگ اختلاف کے باوجود ایک دوسرے سے ٹکراؤ نہیں کرتے۔ جب کہ شمالی ہند کے لوگوں کا حال ہے کہ اختلاف کا کوئی واقعہ سامنے آتے ہی وہ فوراً ٹکراؤ کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جنوبی ہند کا مزاج تحمل ہے، اور شمالی ہند کا مزاج عدم تحمل۔ یہی وہ فرق ہے جس نے دونوں علاقوں کے درمیان

یہ فرق پیدا کر دیا ہے کہ شمالی ہند میں فرقہ وارانہ جھگڑے زندگی کا معمول بن گئے ہیں، جب کہ جنوبی ہند میں فرقہ وارانہ جھگڑوں کا سرے سے کوئی وجود نہیں۔

اوپر کی مثال ایک عملی واقعہ کی صورت میں بتاتی ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل کیا ہے۔ وہ حل یہ ہے کہ لوگوں کے اندر یہ مزاج بنایا جائے کہ وہ فرقہ وارانہ اختلاف کے باوجود فرقہ وارانہ اتحاد کے ساتھ زندگی گزاریں۔ جو صورت حال آج بھی ملک کے ایک حصہ میں قائم ہے، وہی صورت حال ملک کے دوسرے حصہ میں قائم کر دی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا حقیقی اور پائدار حل صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ لوگوں کی سوچ کو درست کیا جائے۔ ہمارے ملک کا یا دوسرے لفظوں میں شمالی ہند کا، اصل مسئلہ یہ ہے کہ مختلف اسباب سے یہاں کے لوگوں کی سوچ بگڑ گئی ہے۔ یہی جڑ کی بات ہے۔ اور اس جڑ پر عمل کر کے ہی فرقہ وارانہ مسئلہ اور دوسرے مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔

کسی سماج میں مختلف فرقوں کا ہونا بالکل فطری بات ہے، وہ ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ باقی رہیں گے۔ ہمارے موجودہ سماج کی اصل برائی خود فرقوں کی موجودگی نہیں، بلکہ مختلف فرقوں کے درمیان تحمل (Tolerance) کی غیر موجودگی ہے۔ فرقہ واریت کا مسئلہ عدم تحمل کا پیدا کردہ ہے، نہ کہ خود فرقوں کی موجودگی کا پیدا کردہ۔

## برداشت کی ضرورت

سماج میں مختلف سطحوں پر فرق اور اختلاف کا ہونا بالکل لازمی ہے۔ آپ سماج کے اوپر یکسانیت کا بلڈوزر نہیں چلا سکتے۔ روسی ڈکٹیٹر اسٹالن نے اپنے ملک میں بے طبقاتی سماج (Classless society) قائم کرنے کے لیے ۲۵ ملین انسانوں کو پیس ڈالا۔ پھر بھی وہ بے طبقاتی سماج بنانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ پھر آپ اس ناممکن کام کو کس طرح ممکن بنا سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ کا قابل عمل حل صرف یہ ہے کہ لوگوں کے اندر تحمل کا مزاج اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ انھیں اختلاف میں اتحاد (Unity in diversitv) کا سبق دیا جائے۔ قومی اتحاد ہم کو اختلاف کے باوجود قائم کرنا ہے نہ کہ اختلاف کے بغیر۔ کیونکہ وہ ممکن ہی نہیں۔

قوم کے افراد کے اندر تحمل کا مطلوبہ مزاج پیدا کرنے کے لیے ہمیں وہی عمل کرنا ہے جس کو فیبین

سوسائٹی نے نفوذ کرنے (Permeation) سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی شعور کو بدلنے کی مہم جاری کر کے لوگوں کے ذہنوں میں گھسنا اور ان کو اندر سے اس طرح بدل دینا کہ ان کے سوچنے کا ڈھنگ وہ ہو جائے جو کہ دراصل ہونا چاہیے۔

قومی اتحاد اور قومی یک جہتی کا لفظ تو اس ملک میں پچھلی نصف صدی سے بولا جا رہا ہے، مگر اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کوئی حقیقی کام مطلق نہیں کیا گیا۔ یہ یقینی ہے کہ کانفرنس کرنا، یا پلے کارڈ لے کر سڑکوں پر مارچ کرنا وہ کام نہیں جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہو۔ اس کام کے لیے شعور کی تربیت کی ایک طویل اور مسلسل مہم درکار ہے، مگر قومی اتحاد کا نعرہ لگانے والوں میں سے کوئی بھی اب تک اپنے آپ کو اس کام کے لیے فارغ نہ کر سکا۔

مثال کے طور پر صحافت اس ذہنی انقلاب کو لانے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ آج ہمارے ملک میں ہزاروں کی تعداد میں اخبار اور رسالے نکل رہے ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی ایک بھی اخبار یا رسالہ نہیں جو اس مقصد کے لیے وقف ہو۔ ہمارے تمام اخبار حقیقۃً سیاسی اخبار ہیں۔ اس کے بعد جو ہفت روزہ، پندرہ روزہ یا ماہنامے ہیں وہ سنسنی خیز مضامین چھاپ کر سستی تجارت کرنے کے سوا کچھ اور نہیں جانتے۔ شعور سازی کے اداروں کا جب یہ حال ہو تو وقتی اپیل جاری کرنے سے کیا فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

راقم الحروف پچھلے ۲۵ سال سے اپنے آپ کو تعمیری صحافت کو وجود میں لانے کے لیے وقف کیے ہوئے ہے۔ ماہنامہ الرسالہ (اُردو اور انگریزی میں) ملک کا واحد ماہنامہ ہے جو تعمیر شعور کا کام کر رہا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ کام اس سے زیادہ بڑا ہے کہ ایک یا دو ماہنامہ اس کو انجام دے سکے۔

## رہنماؤں کی ذمہ داری

حقیقت یہ ہے کہ عوام کو بدلنے کے لیے سب سے پہلے عوام کے رہنماؤں کو بدلنا ہے۔ ہماری قوم کے جو لکھنے اور بولنے والے ہیں، جن کو سن کر اور پڑھ کر لوگ اپنی رائیں بناتے ہیں، ان کی ایک فی صد تعداد بھی اگر اس قربانی پر آمادہ ہو جائے جو پہلی عالمی جنگ اور دوسری عالمی جنگ کے درمیان انگلینڈ کے فیبین لوگوں نے دی تھی۔ تو یقینی طور پر ہمارے ملک کا نقشہ بدل سکتا ہے۔

یہ لوگ یہ طے کر لیں کہ وہ سستی شہرت اور سستی تجارت کے راستہ کو چھوڑ کر خاموش تعمیری کام میں

اپنے آپ کو وقف کریں گے۔ وہ قوم کے اندر مثبت ذہن اور تعمیری مزاج بنانے میں اپنے زبان و قلم کی ساری طاقت خرچ کر دیں گے۔ اور اس کام کو مسلسل جاری رکھیں گے، یہاں تک کہ اسی پر ان کی موت آجائے۔ اگر ہماری قوم کے ذہین طبقہ کا ایک فی صد حصہ بھی یہ عزم کرلے تو مجھے یقین ہے کہ اس کا عزم ہمارے ملک کی تاریخ کو بدل سکتا ہے۔

پنڈت موتی لال نہرو سے کسی نے ایک بار پوچھا کہ جس آزادی کے لیے آپ کوشش کر رہے ہیں، وہ آزادی کب آئے گی۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں آزادی کا وقت تو نہیں جانتا، مگر میں یہ جانتا ہوں کہ اگر میں نے اس راہ میں اپنی جان دے دی تو میری لاش پر آزادی کا محل تعمیر ہو کر رہے گا۔

میں کہوں گا کہ ہمارے ملک کا دانشور طبقہ اگر تربیتِ شعور (Consciousness raising) کی مہم میں اپنے کو فنا کرنے کا عزم کرلے تو ہو سکتا ہے کہ وہ خود اپنے لیے کچھ نہ پا سکے، مگر یہ یقینی ہے کہ اس کی قربانی قوم کو نئی زندگی دینے کا سبب بن جائے گی۔

## چھوٹا کام

تعمیر قوم کا کام تعمیر ذہن سے شروع ہوتا ہے، یہ ایک نہایت واضح بات ہے۔ یہ اتنی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس کو سمجھنا کسی کے لیے مشکل نہیں ہو سکتا۔ اس کے باوجود کیا وجہ ہے کہ آج کوئی شخص نہیں جو اس اہم ترین کام میں اپنے آپ کو مصروف کیے ہوئے ہو۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے کام جن میں لوگ مصروف ہیں، وہ کہنے اور سننے میں بڑے کام معلوم ہوتے ہیں۔ وہ فوراً اخبار میں چھپتے ہیں۔ ان کے ذریعہ صبح و شام میں آدمی کو شہرت و مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہی خاص وجہ ہے جس کی بنا پر تمام حوصلہ مند افراد جوق در جوق ان کاموں کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ اور تعمیر شعور کا میدان بالکل خالی پڑا ہوا ہے۔

تعمیر شعور کا کام بظاہر ایک چھوٹا کام معلوم ہوتا ہے۔ وہ اخباروں میں نمایاں نہیں ہوتا۔ اس کے نام پر بھیڑ جمع نہیں ہوتی۔ اس کی اپیل پر بڑے بڑے چندے نہیں ملتے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اس کام کی اہمیت کو جانتے ہوئے بھی اس کی طرف راغب نہیں ہوتے۔

اگر قوم کے اندر چند ایسے افراد پیدا ہو جائیں جو اعلیٰ صلاحیت رکھتے ہوں، اور اسی کے ساتھ وہ اس بات کا ثبوت دیں کہ وہ چھوٹے کام کو بڑا کام سمجھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں تو اس کے فوراً بعد

ملک و قوم کے مستقبل کی تعمیر کا کام شروع ہو جائے گا، اور جب ایک صحیح کام شروع ہو جائے تو وہ لازماً اپنی منزل پر پہنچ کر رہتا ہے۔ راستہ کی کوئی بھی چیز اس کو روکنے والی نہیں۔

## احتساب غیر، احتساب خویش

آج ہمارے تمام اخبارات اور تمام جلسے، خواہ وہ ہندوؤں کے ہوں یا مسلمانوں کے، سیاسی باتوں سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے لوگوں کو سیاسی موضوعات کے سوا کسی اور موضوع پر کچھ کہنا آتا ہی نہیں۔

یہ صورت حال دراصل خود لکھنے اور بولنے والوں کی اپنی کمزوری پر مبنی ہے۔ سیاست کے موضوع پر کلام کرنا گویا دوسروں کے خلاف کلام کرنا ہے، اور تعمیر کے موضوع پر کلام کرنا خود اپنے خلاف کلام کرنا۔ سیاسی موضوعات میں خارجی پارٹیاں، خارجی شخصیتیں، خارجی واقعات زیر بحث آتے ہیں۔ اس کے برعکس تعمیری موضوعات میں داخلی مسائل اور اندرونی کمزوریاں زیر بحث لائی جاتی ہیں۔ سیاسی موضوع پر بولنا دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرانا ہے، تعمیری موضوع پر بولنا اپنے آپ کو ذمہ دار ٹھہرانا۔ ایک لفظ میں، سیاست دوسروں کا احتساب ہے اور تعمیر خود اپنا احتساب۔ اور یہ معلوم بات ہے کہ دوسروں کا احتساب آدمی کے لیے سب سے زیادہ محبوب چیز ہے اور اپنا احتساب آدمی کے لیے سب سے زیادہ مبغوض چیز۔

لیکن اگر ملک کو ترقی کی طرف لے جانا ہے تو ہمارے لکھنے اور بولنے والوں کو لازماً یہی مبغوض کام کرنا پڑے گا۔ اس کے سوا مستقبل کی تعمیر کی کوئی اور صورت ممکن نہیں۔


**دینِ کامل**

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۳۶۸

ہدیہ ۴۰ روپیہ

قرآن میں اسلام کو دینِ کامل کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام دینِ مستحکم ہے۔ اسلام کا ظہور، دینِ خداوندی کی تاریخ میں ایک دور کا خاتمہ اور دوسرے دور کا آغاز ہے۔ اسلام نے خدا کے دین کے ساتھ انسانی تعدی کے دور کو ختم کر دیا اور دین کو تمام پہلوؤں سے کامل کر کے اس کو ایسا مستحکم بنا دیا کہ قیامت تک اس کی برتری باقی رہے وہ اپنے پیروؤں کے لیے ابدی سرفرازی کی ضمانت بن جائے۔

# جنگ اور امن اسلامی نقطۂ نظر سے

قرآن میں ہے کہ تم یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین کی طرف کر لو ، اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے ، اس کے بنانے کو بدلنا نہیں ہے ، یہی سیدھا دین ہے (الروم ۳۰)

یہی بات حدیث میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ ہر انسان جو اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے وہ صحیح فطرت پر پیدا ہوتا ہے (کل مولود یولد علی الفطرۃ) وہ اس ابدی فطرت کے عین مطابق ہے جو ہر انسان کے اندر پیدائشی طور پر موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات میں اور عقل عام (Common sense) میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔

انسان اپنی فطرت کے تقاضے کے تحت چاہتا ہے کہ دنیا میں امن ہو۔ امن ہر آدمی کی پہلی خواہش ہے۔ فطرت کی آواز امن کی آواز ہے۔ کیوں کہ امن کے بغیر ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہر آدمی کو یکساں طور پر عمل کرنے کے مواقع حاصل ہوں۔ عقیدہ اور نظریہ کے اختلاف کے باوجود سوسائٹی میں پر امن فضا برقرار رہے۔

انسانی فطرت کا یہ تقاضا اسلام کا تقاضا بھی ہے۔ اس معاملہ میں یہی اسلامی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ قرآن میں ہے کہ خدا بے امنی کو پسند نہیں کرتا (البقرہ ۲۰۵) خدا کو وہ لوگ پسند نہیں جو انسانی سماج کے اندر بگاڑ پیدا کرنے والے ہوں (المائدہ ۶۴)

## فساد فی الارض

اسلام کا تصور امن یہ ہے کہ زمین کا نظام ابتدائی مرحلہ میں خالق نے جس طرح قائم کیا ہے اس کو ویسا ہی قائم رکھا جائے۔ اس میں کوئی فرق نہ کیا جائے۔ اس خدائی بندوبست میں گڑبڑ کرنا ، اسی کا نام فساد فی الارض ہے (ہود ۱۱۶)

اس فساد فی الارض کے دو خاص پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ زمین پر خدا نے تقسیم رزق کا جو نظام بنایا ہے اس میں کوئی فرق پیدا نہ کیا جائے۔ مثلاً ایک دریا جس وسیع رقبہ زمین پر بہتا ہے ، اس رقبہ کے تمام لوگوں کو اس سے فائدہ اٹھانے کا یکساں حق حاصل ہے۔ اگر کچھ لوگ بند بنا کر پانی کو اپنے لئے خاص کر لیں اور اسے دوسروں تک پہنچنے نہ دیں تو یہ فساد فی الارض

ہوگا۔ اسی طرح اگر ایک ملک اپنی صنعتی سرگرمیوں کے ذریعہ ہوا میں گیسوں کے تناسب کو بدل دے اور لوگوں کو سانس لینے کے لئے ضروری مقدار میں آکسیجن نہ ملے تو یہ بھی فساد فی الارض ہوگا۔ اسی طرح ایسا اقتصادی نظام جو دولت کی گردش کو یک طرفہ کردے یا اشیاء کی ذخیرہ اندوزی کے نتیجہ میں مصنوعی قلت پیدا ہو جائے، یا جنگی جنون کے نتیجہ میں زمین کی دولت کا بڑا حصہ انسانی تعمیر کے بجائے انسانی تخریب میں استعمال ہونے لگے، تو یہ سب فساد فی الارض ہے، وغیرہ۔

## عالمی نمونۂ عمل

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسانی دنیا کے نظام کو طبیعی دنیا کے نظام کے مطابق ہونا چاہئے۔ طبیعی دنیا کا نظام براہ راست خدا کا مقرر کیا ہوا ہے۔ وہ ربانی معیار پر قائم ہے۔ دوسری طرف انسانی دنیا کا نظام خود انسان اپنے ارادہ سے قائم کرتا ہے۔ یہاں انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنی زندگی کے نظام کو طبیعی دنیا کے نمونہ پر قائم کرے۔ طبیعی دنیا کے نمونہ کی پیروی کا نام اصلاح ہے اور اس سے انحراف کا نام فساد۔ اس کی ایک مثال ستاروں کا نظام ہے۔ خلا میں بے شمار ستارے ہیں۔ وہ سب کے سب حرکت کر رہے ہیں۔ مگر یہ تمام ستارے ہمیشہ اپنے مدار پر حرکت کرتے ہیں۔ وہ اپنے دائرہ سے نکل کر دوسرے دائرہ میں داخل نہیں ہوتے۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ اور سورج، وہ اپنی ٹھہری ہوئی راہ پر چلتا رہتا ہے۔ یہ عزیز و علیم کا باندھا ہوا اندازہ ہے۔ اور چاند کے لئے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں، یہاں تک کہ وہ ایسا رہ جاتا ہے جیسے کھجور کی پرانی شاخ۔ نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو پکڑ لے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے۔ اور سب ایک ایک دائرہ میں تیر رہے ہیں۔ (۳۶ : ۳۸-۴۰)

خلا میں لاتعداد چھوٹے بڑے ستارے ہیں۔ مگر ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مدار (Orbit) پر گھومتا ہے۔ کوئی ستارہ دوسرے ستارہ کی حد میں مداخلت نہیں کرتا۔ یہ گویا خدا کی طرف سے مقرر کیا ہوا ایک نمونۂ عمل (Role-model) ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ بھی اسی نمونہ پر عمل کرے۔ ایک انسان دوسرے انسان کی زندگی میں دخل اندازی کئے بغیر اپنی پوری زندگی

کا سفر جاری رکھے۔

یہی وہ بات ہے جو حدیث میں اس طرح کہی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے میری طرف وحی کی ہے کہ تم لوگ تواضع اختیار کرو۔ یہاں تک کہ ایک شخص دوسرے شخص پر فخر نہ کرے، اور ایک شخص دوسرے شخص پر زیادتی نہ کرے (ان اللہ اوحیٰ الیّ ان تواضعوا حتی لا یفخر احد علی احد ولا یبغی احد علیٰ احد، مشکوٰۃ المصابیح الجزء الثالث، صفحہ ۱۳۷۳)

## جبر و اکراہ نہیں

قرآن میں اجتماعی زندگی کے بارہ میں جو احکام دئے گئے ہیں، ان میں سے ایک اہم حکم عدم اکراہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی کسی پر جبر نہ کرے، کوئی کسی کو اس کی ناپسندیدہ چیز کو اختیار کرنے پر مجبور نہ کرے۔ قرآن میں اس سلسلہ میں بنیادی اصول کے طور پر کہا گیا ہے کہ: لا اکراہ فی الدین (دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں)

اکراہ نہ کرنے کا یہ اصول یک طرفہ نہیں ہے بلکہ دو طرفہ ہے۔ یہی اصول داعی کے لئے ہے، اور یہی اصول مدعو کے لئے۔ اسی اصول کی پابندی ہر انسان کو کرنی ہے، خواہ وہ ایک مذہب یا نظام سے تعلق رکھتا ہو یا دوسرے مذہب اور نظام سے۔ اس کی تائید میں یہاں دو مثالیں قرآن سے نقل کی جاتی ہیں۔

قرآن میں ایک پیغمبر (حضرت شعیب) کی دعوتی مہم کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ان کی قوم نے ان کی دعوت کے جواب میں کس قسم کا ردعمل پیش کیا۔ ارشاد ہوا ہے کہ ان کی قوم کے بڑے، جو متکبر تھے، انھوں نے کہا کہ اے شعیب، ہم تم کو اور ان لوگوں کو جو تمہارے ساتھ ایمان لائے ہیں، اپنی بستی سے نکال دیں گے، یا تم ہماری ملت میں واپس آجاؤ۔ شعیب نے کہا، کیا ہم اس کو ناپسند کرتے ہوں تب بھی (الاعراف ۸۸)

پیغمبر کا یہ جواب بتاتا ہے کہ پیغمبر نے اصولاً اس کو درست نہیں قرار دیا کہ ان کی قوم کے لوگ انھیں اپنے دین (شرک) کو اختیار کرنے پر مجبور کریں۔ پیغمبر اپنی قوم کو یہ حق دینے کے لئے تیار تھا کہ وہ اس کے سامنے اپنا دین پیش کریں، جس طرح خود پیغمبر اپنا دین ان کے سامنے

پیش کر رہا تھا۔ مگر وہ انھیں یہ حق دینے کے لئے تیار نہ تھا کہ وہ "تبلیغ" سے تجاوز کرکے "اکراہ" کے دائرہ میں داخل ہو جائیں۔ وہ کہنے سننے سے آگے بڑھ کر ان پر جبر کرنے لگیں۔

اس معاملہ کا دوسرا پہلو وہ ہے جو حضرت نوح کے تذکرہ کے ذیل میں بیان ہوا ہے۔ حضرت نوح نے اپنی قوم کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی۔ قوم کے بڑوں نے آپ کی دعوت کو ماننے سے انکار کیا۔ اس کے بعد حضرت نوح نے کہا کہ اے میری قوم، بتاؤ، اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہوں۔ اور اس نے مجھ پر اپنے پاس سے رحمت بھیجی ہے، مگر وہ تم کو نظر نہیں آتی تو کیا ہم تم کو اس پر مجبور کر سکتے ہیں، جب کہ تم اس کو ناپسند کر رہے ہو (ہود ۲۸)

پیغمبر کا یہ جواب جو قرآن میں نقل کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اگرچہ اپنے آپ کو صد فی صد برسر حق سمجھتا تھا، اس کے باوجود اس کے نزدیک یہ درست نہ تھا کہ وہ دوسروں کو اپنی بات ماننے پر مجبور کرے۔

قرآن کے مطابق اکراہ (مجبور کرنا) ہر حال میں قابل ترک ہے۔ نہ داعی اور مصلح کو یہ حق ہے کہ وہ مدعو کو اپنی بات ماننے پر مجبور کرے اور نہ مدعو یہ حق رکھتا ہے کہ وہ داعی کو اپنے جبر کا نشانہ بنائے۔ دونوں فریقوں کے لئے ایک ہی صحیح پالیسی ہے اور وہ رواداری (Tolerance) ہے۔ یعنی دونوں کو اپنی بات کے اظہار کا پورا حق ہے۔ مگر دونوں میں سے کسی کو بھی جبر کا کوئی حق نہیں۔ کوئی شخص اپنی بات کو منوانے کے لئے اول و آخر جو چیز استعمال کر سکتا ہے وہ دلیل ہے نہ کہ عملی جبر یا دباؤ۔

## جنگ برائے دفاع

اسلام میں جنگ کی صرف ایک قسم ہے، اور وہ دفاع (Defence) ہے۔ جارحانہ جنگ کسی بھی حال میں اسلام کے اندر جائز نہیں۔ قرآن میں ہے کہ ـــــ وہ لوگ کہ جب ان پر چڑھائی ہوتی ہے تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔ اور برائی کا بدلہ ہے ویسی ہی برائی۔ پھر جس نے معاف کر دیا اور اصلاح کی تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ بیشک وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو شخص اپنے مظلوم ہونے کے بعد بدلہ لے تو ایسے لوگوں کے اوپر کچھ الزام نہیں۔ الزام صرف ان پر ہے جو لوگوں کے اوپر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے دردناک

عذاب ہے۔ اور جس شخص نے صبر کیا اور معاف کر دیا تو بے شک یہ ہمت کے کام ہیں (الشوریٰ ۳۹-۴۳)

اسلام میں جنگ کی حیثیت ایک ناگزیر برائی (Necessary evil) کی ہے۔ دوسروں کی طرف سے جارحیت پیش آنے کے بعد بھی اگر صبر اور اعراض اور گفت و شنید کے ذریعہ امن قائم کرنے کی امید ہو تو جنگ کے بدلے جنگ نہیں کی جائے گی۔ بلکہ صبر و اعراض اور گفت و شنید کے ذریعہ منصفانہ حل تک پہنچنے کی کوشش کی جائے گی۔ اسلام میں جنگ صرف اس وقت ہے جب کہ جنگ کے سوا کوئی اور چارۂ کار سرے سے باقی نہ رہے۔

پیغمبر اسلام کے زمانہ میں آپ کے خلاف ہر قسم کی جارحیت کی گئی۔ مگر آپ نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ جنگ کو اوائڈ (Avoid) کریں۔ آپ کی پوری قولی اور عملی زندگی اسی اصول اعراض (Principle of avoidance) کا نمونہ ہے۔

مثلاً حدیبیہ (۶ ھ) کے سفر میں خالد بن الولید ایک فوج لے کر آپ سے لڑنے کے لئے مکہ سے روانہ ہوئے۔ جب آپ کو یہ خبر معلوم ہوئی تو آپ نے اپنے ساتھیوں کو جوابی تیاری کا حکم نہیں دیا بلکہ سادہ طور پر اپنا راستہ بدل دیا تاکہ دونوں فریقوں کے درمیان ٹکراؤ کی نوبت ہی نہ آئے۔ اسی طرح غزوۂ احزاب (۵ ھ) کے موقع پر آپ کے مخالفین بہت بڑا لشکر لے کر آئے تاکہ مدینہ پر حملہ کریں۔ آپ کو دشمن کی روانگی کی خبر ملی تو یہاں بھی آپ نے جوابی مقابلہ کا اہتمام نہیں کیا۔ اس کے برعکس آپ نے یہ کیا کہ مدینہ کی سرحدوں پر لمبی خندق کھود دی تاکہ آپ کے اور آپ کے دشمنوں کے درمیان ایک آڑ قائم ہو جائے اور دونوں فریقوں کے درمیان جنگ کی نوبت نہ آئے۔ حدیبیہ (۶ ھ) کے موقع پر آپ کے حریف قریش آپ سے لڑنے کے لئے تیار تھے۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے ہر قسم کی اشتعال انگیزی اور جارحیت کی۔ مگر آپ سب کچھ یک طرفہ طور پر برداشت کرتے رہے اور قریش پر کوئی جوابی حملہ نہیں کیا۔ آخر میں آپ نے خود قریش کی یک طرفہ شرائط کے تحت دس سالہ ناجنگ معاہدہ پر دستخط کر دئے۔

## پیغمبر کا اسوہ

پیغمبر اسلام ۶۳ سال تک دنیا میں رہے۔ آپ کی پیغمبرانہ عمر ۲۳ سال تھی۔ اس مدت میں

آپ کے خلاف مسلسل طور پر بدترین قسم کی اشتعال انگیزی اور جارحیت کی گئی۔ مگر اس پوری مدت میں آپ نے ایک بار بھی اپنے مخالفین کے اوپر جارحانہ حملہ نہیں کیا۔ آپ نے اپنی پوری زندگی میں براہ راست طور پر صرف تین بار جنگ کی ہے، اور یہ تینوں جنگیں یقینی طور پر مدافعانہ تھیں ـــــ بدر (۲ھ) احد (۳ھ) اور حنین (۸ھ) صرف یہی تین جنگیں ہیں جن میں آپ نے براہ راست شرکت فرمائی۔ مگر یہ تینوں جنگیں وہ تھیں جن میں خود آپ کے مخالفین آپ کے اوپر حملہ آور ہوئے تھے۔ چوں کہ ان تینوں مواقع پر مدافعت کے سوا اور کوئی صورت نہ تھی اس لئے آپ نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ان کا مقابلہ کیا۔

اسلام میں امن ہے مگر جنگ نہیں، اسلام میں مدافعت ہے مگر جارحیت نہیں۔ اسلام میں رواداری ہے مگر تشدد نہیں۔ اسلام انسان کو دارالسلام (سلامتی کے گھر) کی طرف لے جانا چاہتا ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی: واللہ یدعوا الیٰ دارالسلام (یونس ۲۵)

## فطرت کے مطابق

ماسکو سے نکلنے والے انگریزی ماہنامہ اسپٹنک (Sputnik) کے شمارہ نومبر ۱۹۸۶ میں ایک مضمون چھپا ہے۔ اس میں ایک چھوٹے سے واقعہ کا ذکر ہے جو بہت سبق آموز ہے۔

اس میں بتایا گیا ہے کہ سوویت یونین کے سابق پریسڈنٹ یوری اینڈروپوف (Yuri Andropove) ۱۹۸۳ میں امریکہ گئے۔ جب وہ وہاں ایر پورٹ پر اترے تو ان کا استقبال کرنے والوں میں ۱۱ سال کی ایک امریکی لڑکی بھی تھی۔ اس کا نام سمنتھا اسمتھ (Samantha Smith) تھا۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ ایر پورٹ پر پہنچی تھی۔ وہ روسی صدر سے ملی اور اپنے معصومانہ انداز میں ان سے کہا کہ آپ جنگ چاہتے ہیں یا امن:

Are you for war or peace?

روسی صدر پر چھوٹی بچی کے اس سادہ جملہ کا بہت اثر ہوا۔ واپس لوٹنے کے بعد بھی وہ اس کو بھلا نہ سکے۔ جلد ہی بعد سمنتھا اسمتھ کو روسی صدر کا ایک خط ملا جس میں اس کو حکومت روس کے مہمان کی حیثیت سے سوویت روس کا سفر کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس کے مطابق جون ۱۹۸۳ میں سمنتھا اسمتھ نے سوویت روس کا سفر کیا۔ سوویت روس کے دو ہفتہ دورہ کے بعد سمنتھا اسمتھ

نے اپنا تاثر بیان کرتے ہوئے کہا کہ اب میں مطمئن ہوں کہ روسی جنگ نہیں چاہتے :

Now I'm sure—the Russians don't want war.

یہ چھوٹا سا واقعہ اپنے اندر ایک زبردست سبق رکھتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے امن چاہتا ہے۔ ۱۱ سال کی ایک بچی جو ابھی اپنی ابتدائی فطرت پر تھی۔ جو ابھی مصنوعی تمدن کے اثرات سے آزاد تھی، اس کا مذکورہ سوال درحقیقت فطرت کا سوال تھا۔ اس کی فطرت ایک ایسی دنیا سے مطابقت نہیں کر پا رہی تھی جہاں جنگ کے نعرے ہوں، جہاں گولی کی منطق سے معاملات کا فیصلہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ جہاں انسان اپنے جان و مال کو محفوظ نہ پاتا ہو۔ اسی نفسیات کے تحت اس نے روسی صدر سے مذکورہ سوال کیا۔

اسلام درحقیقت انسانی فطرت کی اسی پکار کا جواب ہے۔ جس خدا نے انسان کے اندر امن پسند فطرت بنائی ہے، اسی خدا نے دین اسلام بھی اتارا ہے جو سراسر امن و سلامتی کا مذہب ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن میں ان لفظوں میں بتایا گیا ہے کہ اللہ امن و سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔

خدا یہ چاہتا ہے کہ انسان دنیا میں امن و سلامتی کے ساتھ زندگی گزارے، تاکہ آخرت میں اس کو ابدی امن و سلامتی کے باغوں میں بسایا جائے۔ آخرت کی پر امن دنیا انھیں لوگوں کے لئے ہے جنھوں نے موجودہ دنیا میں پر امن رہنے کا ثبوت دیا ہو۔ کسی مومن کے لئے یہ سب سے بڑا محرک ہے جو اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ موجودہ دنیا میں لوگوں کے ساتھ پر امن بن کر رہے۔ وہ دوسروں کے لئے مسئلہ پیدا کئے بغیر اپنا مسئلہ حل کرے۔


حیدرآباد میں الرسالہ اور اسلامی مرکز کی کتابوں کے لیے

مندرجہ ذیل پتہ پر رابطہ قائم کریں :

AL-RISALA ACADEMY
3-5-780/19/2, King Kothi
Opposite: Azam Manzil
HYDERABAD 500 039
Phone: 231607

## عمر ونشر الدعوة الإسلامية

عمل عمر جهده وصرف عنايته على نشر الدعوة الإسلامية بتبليغها للناس ودعوتهم إليها بالحسنى ، فصار يرسل إلى القادة وإلى الأمراء والحكومات يدعوهم إلى الإسلام ويرسل الفقهاء لدعوة الناس وتعليمهم الدين الصحيح وحقيقة التوحيد ، وقد آتى ذلك ثماره ودخل الناس في دين الله أفواجاً ، فوضع عمر الجزية عمن أسلم ، فكان ذلك دافعاً لدخول الناس في الدين الجديد حين علموا صفاءه ونقاءه وأنه لايرهق الناس ولايبخسهم حقهم ، ولقد لامه بعض عمال الأقاليم على سياسة وضع الجزية ، ولكن عمر يجابهه بالقول الفصل « ضع الجزية عمن أسلم قبح الله رأيك فإن الله إنما بعث محمداً ﷺ هادياً ولم يبعثه جابياً ، ولعمري لعمر أشقى من أن يدخل الناس كلهم في الإسلام على يديه ».

وفي خراسان أقلق بعض من لهم مصالح خاصة دخول الناس بكثرة في الإسلام فتقدموا إلى الجراح عاملها أن يمتحن هؤلاء الناس بالختان ليعرف رغبتهم الحقيقية ، فنقل الجراح ذلك إلى عمر . فرد عليه رداً حاسماً قاطعاً : « إن الله بعث محمداً ﷺ داعياً ولم يبعثه خاتنا ». وتأتي إليه رسالة عامله على البصرة التي يقول فيها : « الناس قد كثروا في الإسلام وخفت أن يقل الخراج » فيجيبه عمر : « فهمت كتابك والله لوددت أن الناس كلهم أسلموا حتى نكون أنا وأنت حراثين نأكل من كسب أيدينا ».

وتوسع عمر في دعوته فأرسل الرسائل إلى جميع ملوك الأرض يدعوهم إلى الدخول في الإسلام فأرسل إلى الهند وإلى ماوراء النهر ، فاستجاب له خلق كثير ، ونشط عمال الولايات حين رأوا هذه الرغبة من عمر حتى أنه ليقال : إنه قد دخل على يد الجراح عامله على خراسان أكثر من أربعة آلاف شخص في الإسلام .

# عمر بن عبد العزیز

مجلہ البحوث الاسلامیہ (ریاض) ایک علمی مجلہ ہے۔ اس کے شمارہ ۲۳ (۱۴۰۸ھ) میں خلیفہ عمر بن عبد العزیز کے بارے میں ایک مفصل مقالہ شائع ہوا ہے۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے۔

عمر بن عبد العزیز نے اسلامی دعوت کو پھیلانے کی کافی کوشش کی۔ اور لوگوں کے درمیان اسلام کی تبلیغ کے لیے اپنی توجہ صرف کی۔ انھوں نے بڑے بڑے سرداروں اور حکمرانوں کو اسلام کی طرف دعوت دی۔ اور علماء کو بھیجا کہ وہ اسلام کی سچی تعلیمات اور دینِ توحید سے انھیں باخبر کریں۔

ان کی ان کوششوں نے پھل دیا اور لوگ بڑی تعداد میں اسلام میں داخل ہوئے۔ عمر بن عبد العزیز نے ان لوگوں کا جزیہ معاف کر دیا جو اسلام لائے تھے۔ یہ لوگوں کے لیے اسلام میں داخل ہونے کا مزید سبب بنا، جب انھوں نے جانا کہ اسلام میں داخل ہونے سے ان کے حقوق کم نہیں ہوتے بلکہ اور زیادہ ہو جاتے ہیں۔

ان کے گورنروں میں سے ایک گورنر نے انھیں جزیہ ساقط کرنے کے طریقہ پر ملامت کی۔ عمر بن عبد العزیز نے فیصلہ کن لہجہ میں اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ جو اسلام قبول کرے اس کا جزیہ ساقط کر دو۔ تمہاری یہ رائے بہت بری ہے۔ کیوں کہ اللہ نے محمدؐ کو ہدایت دینے والا بنا کر بھیجا، اس نے انھیں ٹیکس وصول کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا۔ اور میری جان کی قسم، عمر اس سے زیادہ شقی ہے کہ سارے لوگ اس کے ہاتھ پر اسلام میں داخل ہو جائیں۔

خراسان میں بعض لوگ اپنی ذاتی مصلحت کی بنا پر کثرت سے لوگوں کے داخلِ اسلام ہونے پر متردد ہوئے۔ انھوں نے وہاں کے گورنر الجراح سے کہا کہ وہ نومسلموں کی آزمائش کریں اور انھیں ختنہ کرنے کا حکم دیں تاکہ یہ ظاہر ہو سکے کہ کیا وہ حقیقی رغبت کی وجہ سے مسلمان ہوئے ہیں۔ الجراح نے اس بارے میں عمر بن عبد العزیز کو لکھا۔ انھوں نے سخت جواب دیتے ہوئے کہا کہ اللہ نے محمدؐ کو دعوت دینے والا بنا کر بھیجا، اس نے آپ کو ختنہ کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا۔ اسی طرح بصرہ کے گورنر نے انھیں لکھا کہ لوگ بہت زیادہ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ خراج کی رقم کم ہو جائے گی۔ عمر بن عبد العزیز نے جواب دیا کہ جو کچھ تم نے لکھا ہے اس کو میں نے جانا۔

خدا کی قسم مجھے یہ پسند ہے کہ تمام لوگ اسلام قبول کرلیں اور میں اور تم ہل چلانے والے بن جائیں، اور اپنے ہاتھ کی محنت سے اپنی معاش حاصل کریں۔

عمر بن عبدالعزیز نے وسیع دائرہ میں اسلام کی دعوت پھیلائی۔ انھوں نے تمام بادشاہوں کے نام خط لکھے اور انھیں اسلام میں داخل ہونے کی طرف بلایا۔ مثلاً ہندستان اور ماوراء النہر وغیرہ۔ اس کے بعد بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ عمر بن عبدالعزیز کے گورنروں نے جب خلیفہ میں دعوتی رغبت دیکھی، تو انھوں نے بھی اس میدان میں کافی سرگرمی دکھائی۔ یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ خراسان کے گورنر الجراح کے ہاتھ پر ۴ ہزار سے زیادہ افراد مسلمان ہوئے۔

عمر بن عبدالعزیز غالباً اسلامی تاریخ کے آخری معلوم شخص ہیں جن کے اندر دعوت کا شعور پوری طرح زندہ تھا۔ جو کامل طور پر جانتے تھے کہ دعوت کیا ہے اور دعوت کیا نہیں ہے۔ وہ اس اس راز سے واقف تھے کہ اسلام میں سب سے زیادہ قابل لحاظ چیز دعوت ہے۔ جب دعوت کی مصلحت اور دوسری مصلحتوں کے درمیان ٹکراؤ ہو تو دعوت کی مصلحت کو ترجیح دی جائے گی اور دوسری تمام مصلحتوں کو نظر انداز کر دیا جائے گا، خواہ بظاہر وہ کتنی ہی زیادہ اہم نظر آتی ہوں۔

موجودہ زمانہ میں، کم از کم معروف مسلمانوں کے درمیان، دعوت کا شعور مکمل طور پر ختم ہو چکا ہے۔ حتی کہ ان میں سے جو لوگ دعوت کا نام لیتے ہیں، وہ بھی دعوت کی حقیقت سے اتنے ہی بے خبر ہیں جتنا کہ نام نہ لینے والے لوگ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک طرف دعوت کا نام لیتے ہیں اور دوسری طرف ایسی باتیں کرتے ہیں جو دعوت کے لیے زہر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ داعی کا کریڈٹ لینا چاہتے ہیں، بغیر اس کے کہ انھوں نے دعوت کو سمجھا ہو، بغیر اس کے کہ انھوں نے اپنے آپ کو داعیانہ ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے تیار کیا ہو۔


**اقوالِ حکمت**    صفحات ۲۰۰    ہدیہ ۱۵ روپیہ

# دعوت اور عمل

کوئی داعی اس وقت اللہ کی نظر میں داعی ہے جب کہ وہ داعی ہونے کے ساتھ عامل بھی ہو۔ آدمی جب کسی دوسرے شخص کو نیکی کی تلقین کرے تو سنجیدگی کا تقاضہ ہے کہ وہ خود بھی اس پر کاربند ہو۔ حضرت شعیب نے اپنی قوم سے فرمایا کہ میں نہیں چاہتا کہ میں خود وہی کام کروں جس سے میں تم کو روک رہا ہوں (ہود ۸۸)

مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ عمل، دعوت کی شرط ہے۔ دعوت تبلیغ کا کام ہر حال میں جاری رکھا جائے گا خواہ داعی عامل ہو یا نہ ہو۔ مفسر ابن کثیر نے سورۃ البقرہ (آیت ۴۴) کے تحت لکھا ہے:

فکل من الامر بالمعروف وفعله واجب لایسقط احدهما بترك الآخر علی اصح قولی العلماء من السلف والخلف وذهب بعضهم الی ان مرتکب المعاصی لاینهی غیره عنها۔ وهذا ضعیف واضعف منه تمسکهم بهذه الآیة فانه لاحجة لهم فیها، والصحیح ان العالم یامر بالمعروف وان لم یفعله وینهی عن المنکر وان ارتکبه، وقال مالك عن ربیعة سمعت سعید بن جبیر یقول لوکان المرء لایامر بالمعروف ولاینهی عن المنکر حتی لایکون فیه شیء ما امر احد بمعروف ولانهی عن منکر۔ قال مالك وصدق من ذا الذی لیس فیه شیء۔ (تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۸۵)

پس معروف کی تلقین کرنا اور اس پر عمل کرنا دونوں ہی واجب ہیں، ان میں سے کوئی ایک دوسرے کے ترک سے ساقط نہیں ہوتا۔ علماء سلف اور علماء خلف کا صحیح ترین قول یہی ہے۔ ان میں سے بعض اس طرف گئے ہیں کہ جو شخص گناہوں کا مرتکب ہو وہ دوسرے کو انھیں گناہوں سے نہ روکے۔ مگر یہ قول ضعیف ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ ضعیف بات یہ ہے کہ اس کو سورۃ البقرہ کی آیت (اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم) سے نکالا جائے، کیوں کہ اس میں ان کے لیے کوئی دلیل نہیں۔

صحیح بات یہ ہے کہ عالم معروف کی تلقین کرے گا اگرچہ وہ اس پر عمل نہ کرتا ہو اور وہ منکر سے روکے گا اگرچہ وہ خود اس کا مرتکب ہو۔ مالک نے ربیعہ سے نقل کیا ہے، انھوں نے کہا کہ میں نے سعید بن جبیر کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اگر ایسا ہوتا کہ آدمی صرف اس وقت معروف کی تلقین

کرے اور منکر سے روکے جب کہ اس کے اندر کوئی چیز پائی نہ جارہی ہو تو کسی شخص نے بھی معروف کی تلقین نہ کی ہوتی اور نہ وہ منکر سے روکتا۔ امام مالک نے کہا اور سچ کہا کہ کون شخص ہے جس کے اندر کوئی چیز نہیں۔

اس معاملہ میں علمار اسلام کا اتفاق اس لیے ہے کہ یہ ایک اصول کا مسئلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوت کے لیے عمل کی شرط دعوت کو ہمیشہ کے لیے ناقابل عمل بنا دیتی ہے۔ کیوں کہ ایک سچا عامل اور صالح انسان اللہ سے ڈرنے والا انسان ہوتا ہے۔ ایسا آدمی آخرت کے احساس سے کانپتا رہتا ہے۔ اس کا احساس احتساب اتنا بڑھ جاتا ہے کہ وہ اپنے بظاہر عمل کو بھی بے عمل سمجھنے لگتا ہے۔ ایسی حالت میں کون ہوگا جو اپنے صالح اور باعمل ہونے کا یقین کرے اور اس کے بعد وہ دعوت اسلامی کا آغاز کرے۔

اصل یہ ہے کہ دعوت احساس ذمہ داری کے تحت ظاہر ہونے والا عمل ہے نہ کہ احساس صالحیت کے تحت۔ مدعو بھی جب اپنے دین کو چھوڑ کر اسلام کو اختیار کرتا ہے تو وہ اسلام کی اپنی صداقت کی بنا پر ایسا اقدام کرتا ہے نہ کہ مسلمانوں کو باعمل ہونے کو دیکھ کر۔ اگر داعی کے باعمل ہونے کو دیکھ کر لوگ حق کو قبول کرتے تو تمام انبیار کے گرد انسانوں کی بھیڑ دکھائی دیتی۔ مگر معلوم ہے کہ آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی بھی پیغمبر کے گرد انسانوں کی کوئی بڑی جماعت اکھٹا نہیں ہوتی۔ صحیح بات یہ ہے کہ دعوت ہر حال میں دینا ہے اور ہر شخص کو دینا ہے، اس کے لیے مذکورہ قسم کی کوئی شرط نہیں لگائی جاسکتی۔


## الرسالہ (ہندی)

ماہنامہ الرسالہ کا ہندی ایڈیشن نکالنے کی تیاریاں جاری ہیں۔ انشار اللہ بہت جلد پہلا شمارہ منظر عام پر آرہا ہے۔ صاحبان ایجنسی اپنی مطلوبہ تعداد سے مطلع فرمائیں۔

فی شمارہ پانچ روپیہ ☐ سالانہ زر تعاون ساٹھ روپیہ

مینجر الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۳

# عبرت ناک

عُرابی پاشا (۱۹۱۱ - ۱۸۳۹) مصر کے ایک سیاسی لیڈر تھے۔ ان کا نعرہ تھا: مصر للمصریین (مصر مصریوں کے لیے) ان کے زمانہ میں مصر میں خدیو اسماعیل پاشا کی حکومت تھی۔ انھوں نے خدیو کو غدار قرار دیا۔ ان کو یہ شکایت تھی کہ خدیو اسماعیل پاشا مغربی طاقتوں کا ایجنٹ ہے چنانچہ انھوں نے خدیو اسماعیل پاشا کے خلاف بغاوت کر دی۔ یہ ۱۸۸۱ کا واقعہ ہے۔ مگر ان کی بغاوت مکمل طور پر ناکام رہی۔ خدیو اسماعیل پاشا نے اپنے بچاؤ کے لیے برطانیہ سے مدد مانگی۔ برطانیہ نے فوراً ان کی پکار پر لبیک کہا۔ چنانچہ برطانی فوجوں کی مدد سے بغاوت کچل دی گئی اور عُرابی پاشا کو گرفتار کر لیا گیا۔ مزید یہ ہوا کہ ۱۸۸۲ میں مصر پر برطانیہ کا اقتدار قائم ہو گیا۔

اس بغاوت میں عُرابی پاشا کا جن لوگوں نے ساتھ دیا ان میں فوجی لوگوں کے علاوہ مشہور دینی مُصلح شیخ محمد عبدہٗ (۱۹۰۵ - ۱۸۴۹) اور ان کے ساتھی بھی شامل تھے۔ تاہم شیخ محمد عبدہ اور ان کے ساتھیوں کی شمولیت کے باوجود بغاوت کامیاب نہ ہو سکی۔ "اسلام" کو مصر کا تخت دلانے کی کوشش میں "انگریز" مصر کے تخت پر قابض ہو گیے۔

شیخ محمد عبدہ اسلام کے علم بردار تھے۔ دوسری طرف انگریز غیر اسلام کا جھنڈا اٹھائے ہوئے تھے۔ مگر اس کے مقابلہ میں اسلام کے علم بردار مکمل طور پر ناکام رہے۔ اور غیر اسلام کے علم برداروں کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔

یہ ایک واضح مثال تھی کہ محض اسلام کے نام پر جھنڈا لے کر اٹھنا مقابلہ کی اس دنیا میں کامیابی کی ضمانت نہیں ہے۔ کامیابی کے لیے حقیقی حالات کی مساعدت بھی ناگزیر طور پر ضروری ہے۔

مگر عجیب بات ہے کہ اسی مصر میں ٹھیک یہی ناکام کہانی دوبارہ ۱۹۵۲ میں دہرائی گئی۔ ۱۸۸۱ کے "اسلامی جہاد" کا نشانہ خدیو اسماعیل پاشا تھا۔ اور ۱۹۵۲ کے "اسلامی جہاد" کا نشانہ شاہ فاروق الاول تھا۔ پہلے جہاد کے قائد عُرابی پاشا تھے اور ان کے ساتھ مفتی محمد عبدہٗ اور ان کی جماعت شریک تھی۔ دوسرے جہاد کے قائد جمال عبد الناصر تھے اور سید قطب اور ان کی جماعت حامیٔ انقلاب بن کر ان کے ساتھ شریک ہو گئی۔ مگر جو انجام پہلے جہاد کا ہوا تھا، عین وہی انجام

دوسرے جہاد کا بھی ہوا۔

ان دونوں کوششوں میں ظاہری اعتبار سے بعض فرق تھے۔ مگر جہاں تک "اسلامی مجاہدین" کا تعلق ہے، دونوں مواقع پر ان کا بالکل یکساں انجام ہوا۔ غیر اسلامی عناصر دونوں بار غالب رہے اور مسلم مجاہدین دونوں بار مکمل طور پر ناکامی کا شکار ہو کر رہ گیے۔

یہی کہانی زیادہ بری شکل میں پاکستان میں دہرائی گئی ہے۔ پاکستان میں سابق صدر جنرل محمد ایوب خاں کو اسلام کی راہ میں اصل رکاوٹ سمجھ لیا گیا۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی اور ان کے اسلام پسند ساتھی تنہا اپنی طاقت سے اس رکاوٹ کو دور نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے دوسری طاقتوں کو ساتھ لے کر ایوب خاں کو تخت سے بے دخل کرنے کی مہم چلائی۔ اس مہم کو وہ اتنا زیادہ ضروری سمجھتے تھے کہ ایوب خاں کے مقابلہ میں انھوں نے ایک خاتون کو صدر کی حیثیت سے کھڑا کیا۔ حالاں کہ حدیث میں واضح طور پر موجود ہے کہ کوئی خاتون حکمران کسی ملک یا قوم کو فلاح کی طرف نہیں لے جا سکتی۔ مگر جب یہ مہم کامیاب ہوئی تو صدر ایوب کی جگہ دوسرے "اسلام دشمن افراد" ملک کے حکمراں بن چکے تھے۔ یہی مہم دوبارہ پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف شروع کی گئی۔ اسلام پسندوں اور غیر اسلام پسندوں کی متحدہ کوشش سے مسٹر بھٹو کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ مگر اس کے باوجود "غیر اسلام" کو پھانسی پر چڑھانا ممکن نہ ہو سکا۔ وہ بھٹو کے خاتمہ کے بعد بھی پاکستان میں پوری طرح زندہ ہے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ۔

حدیث میں بتایا گیا ہے کہ مومن ایک بل سے دو بار نہیں ڈسا جاتا۔ (المومن لا یلدغ من جحر مرتین) اس لحاظ سے ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا کہ مسلم رہنما ایک ہی غلطی کو بار بار دہراتے رہیں۔ مگر مذکورہ مثالیں حیرت انگیز طور پر بتاتی ہیں کہ وہ ایک ہی سیاسی بل سے بار بار ڈسے جا رہے ہیں۔ وہ ایک ہی ناکام سیاسی تجربہ کو بار بار دہرائے چلے جا رہے ہیں۔ خدا کے دین کی یہ کیسی عجیب عملی تفسیر ہے جس کو موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ اگر وہ کرنا نہیں جانتے تو کیا وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ کچھ نہ کریں۔ اگر انھیں بولنا نہیں آتا تو کیا انھیں یہ بھی نہیں آتا کہ وہ اپنی زبان کو بند رکھیں۔

آہ وہ لوگ، جنھیں کرنا نہیں آتا۔ پھر بھی وہ کرتے ہیں۔ جنھیں بولنا نہیں آتا پھر بھی وہ بولتے ہیں، صرف اس لیے کہ جو مواقع کار ابھی باقی ہیں وہ بھی باقی نہ رہیں، یہاں تک کہ نہ کسی کے لیے کرنے کا کچھ موقع ہو اور نہ کچھ بولنے کا۔

# ایک سفر

شیو گنج، راجستھان کا ایک تاریخی قصبہ ہے۔ یہاں کے لئے میرا پہلا سفر غالباً ۱۹۷۶ میں ہوا تھا۔ اس کی روداد لکھی نہ جاسکی۔ دوسرا سفر فروری ۱۹۷۸ میں ہوا۔ اس سفر کی روداد الرسالہ اپریل ۱۹۷۸ میں شائع ہو چکی ہے۔

پہلے سفر کا ایک واقعہ مجھے اب تک یاد ہے۔ میں نے وہاں اپنے میزبان سے کہا کہ میں بالکل سادہ کھانا پسند کرتا ہوں۔ اس کے بعد جب دسترخوان بچھایا گیا تو حسب معمول تمام دعوتی کھانے موجود تھے۔ اسی کے ساتھ دسترخوان کے ایک طرف میرے لئے "سادہ کھانا" بھی رکھا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے میزبان سے کہا کہ یہ تو میں نے آپ کو دہرا زحمت دے دی۔ انھوں نے کہا کہ آپ کے ساتھ دوسرے لوگ جو دسترخوان پر ہیں ان کی رعایت کی بنا پر ایسا کیا گیا ہے۔

اس طرح کے چند تجربات کے بعد میں نے اپنا یہ معمول بنالیا کہ سفر کے موقع پر سادہ کھانے کے بارے میں اپنی پسند کا ذکر نہ کروں۔ اس کے بجائے اب میں ایسا کرتا ہوں کہ دسترخوان پر جب چیزیں رکھی جائیں، تو ان میں جو چیز نسبتاً سادہ ہو اس کو لے کر خاموشی سے اسے کھالوں۔ کیونکہ موجودہ حالت میں سادہ کھانے کی فرمائش کرنا میزبان کو دہرا مشقت میں مبتلا کرنا ہے۔

شیو گنج کے لئے میرا تیسرا سفر موجودہ سفر ہے جو جولائی ۱۹۸۹ کے آخری ہفتہ میں ہوا۔ اس سفر میں راجستھان کے کئی مقامات دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اور بہت سے مقامات کے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اس طرح اس سفر کے دوران تقریباً پورے راجستھان کے بارہ میں معلومات حاصل کرنے کا موقع ملا۔

۲۷ جولائی ۱۹۸۹ کی شام کو دہلی سے روانگی ہوئی "آشرم سپر فاسٹ ایکسپریس ۶ بجکر ۱۰ منٹ پر پلیٹ فارم نمبر ۷ سے روانہ ہوگی" اسٹیشن کے لاؤڈ اسپیکر سے اعلان ہوا۔ جیسے ہی گھڑی کی ایک سوئی ۶ پر تھی اور دوسری سوئی ۱۰ پر، حرکت شروع ہوئی اور گاڑی چلنے لگی۔ اب جو سوار تھا وہ اتر نہیں سکتا تھا، اور جو سوار نہیں تھا وہ چڑھ نہیں سکتا تھا۔

یہی وسیع تر زندگی کا معاملہ ہے۔ کبھی ایک شخص پیچھے لوٹنا چاہتا ہے، مگر وہ لوٹ نہیں سکتا۔

کیوں کہ زمانہ کی رفتار آگے جا چکی۔ اسی طرح کبھی ایک شخص آگے جانا چاہتا ہے، مگر وہ نہیں جا سکتا۔ کیوں کہ وہ زمانہ سے پیچھے رہ گیا۔

گاڑی تیزی کے ساتھ لوہے کی پٹری پر دوڑ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ پٹریاں اگر مٹی کی ہوں، کیا تب بھی گاڑی اسی طرح دوڑے گی۔ دل نے کہا کہ نہیں۔ پھر میری نظر دونوں طرف پھیلے ہوئے سرسبز درختوں کی طرف گئی۔ میں نے سوچا کہ ان درختوں کی جڑوں میں اگر مٹی کے بجائے لوہا ہو، تب بھی کیا یہ درخت اسی طرح ہرے بھرے ہو کر کھڑے رہیں گے۔ دل نے دوبارہ کہا کہ نہیں۔ گاڑی مٹی پر نہیں چل سکتی۔ درخت لوہے پر نہیں اُگ سکتا۔

یہ اس دنیا کے لئے خدا کا قانون ہے۔ یہاں وہی شخص اپنی گاڑی تیز دوڑا سکتا ہے جس نے اس کے نیچے لوہے کی پٹریاں بچھائی ہوں۔ اسی طرح یہاں وہی شخص ہرے بھرے باغ کا مالک بن سکتا ہے جس نے اپنے درخت کو نرم مٹی میں اگایا ہو۔ اس دنیا میں ہر چیز کا ایک قانون ہے۔ یہاں وہی شخص کسی چیز کو پاتا ہے جس نے اس کے لئے مخصوص قانون کے مطابق اس کو پانے کی کوشش کی ہو۔

ٹرین تیزی کے ساتھ دہلی سے راجستھان کی طرف دوڑ رہی تھی۔ میں نے کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا تو سورج افق کے نیچے جا رہا تھا تاکہ کچھ دیر کے بعد غروب ہو جائے۔ بظاہر یہ دونوں الگ الگ واقعات تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دونوں ایک تھے۔ دونوں خود ٹرین کے دو سفروں کو بتا رہے تھے۔ ٹرین اپنے انجن کے زور پر دہلی سے راجستھان کی طرف دوڑ رہی تھی۔ دوسری طرف زمین کی گردش کے تحت اس کا دوسرا سفر جاری تھا۔ یہ سفر اس کو دن سے رات کی طرف لے جا رہا تھا۔ ٹرین ایک اعتبار سے دہلی سے راجستھان کی طرف جا رہی تھی اور دوسرے اعتبار سے دن سے رات کی طرف۔

اس دنیا میں آدمی کا ایک سفر وہ ہے جو وہ اپنے ارادہ سے کرتا ہے۔ دوسرا سفر وہ ہے جو قضا وقدر کے حکم کے تحت جاری ہے۔ اسی سے جبر وقدر کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس دنیا میں آدمی جبر واختیار کے درمیان ہے۔ ایک اعتبار سے وہ آزاد ہے کہ وہ جدھر چاہے جائے۔ دوسرے اعتبار سے وہ مجبور ہے کہ وہ اسی انجام کو پہنچے جو خدا نے اس کے لئے مقدر کر دیا ہے۔

موجودہ سفر میری زندگی کا بڑا عجیب سفر تھا۔ دہلی میں ۲۲ جولائی کو میرے لڑکے ڈاکٹر ظفر الاسلام

خاں کا ایکسڈنٹ ہوگیا۔ وہ ایک بھاری گاڑی کے نیچے آگئے۔ ان کو سخت زخم آئے اور ان کے دائیں پاؤں کی ایک ہڈی ٹوٹ گئی۔ بوقت سفر وہ ولنگڈن نرسنگ ہوم (کمرہ نمبر ۳۸) میں داخل تھے۔ اس حادثہ کی تفصیل بڑی دردانگیز اور غم انگیز ہے۔ خلاصہ یہ کہ میں نہایت دل شکستہ حالت میں دہلی سے روانہ ہوا۔ رات کے وقت ٹرین میں سویا تو نیند نہیں آرہی تھی۔ تین گھنٹہ تک اپنی برتھ پر کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کے بعد جھپکی کے ساتھ ایک نیند آئی۔ اسی حالت میں خواب دیکھا کہ ظفر الاسلام کرتا اور پائجامہ پہنے ہوئے ہیں اور بالکل نارمل انداز میں چلتے ہوئے میری طرف آرہے ہیں۔

یہ خواب ۲۷ جولائی اور ۲۸ جولائی کی درمیانی رات میں ٹرین کے اندر دیکھا۔ اس کو میں نے اللہ کی طرف سے بشارت سمجھا۔ اس کے بعد دل کو سکون آگیا اور پھر جلد ہی نیند آگئی۔ اسی قسم کا خواب دہلی واپس آنے کے بعد دوبارہ ۸ اگست اور تیسری بار ۱۵ اگست ۱۹۸۹ کو دیکھا۔ حادثہ کے تین مہینے بعد اب خدا کے فضل سے یہ خواب واقعہ بن چکا ہے ـــــ اس دنیا میں حادثات بھی ہیں، اور اسی کے ساتھ حادثات کی تلافی کے لئے خدا کی طرف سے خصوصی انتظام بھی۔

دہلی کا ایک سہ روزہ مسلم اخبار ہے۔ اس کی پیشانی پر قرآن کی ایک آیت کا ترجمہ ان لفظوں میں لکھا ہوا ہوتا ہے: اس شخص سے بہتر کس کی بات ہوسکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔ اس اخبار کے شمارہ ۲۲ جولائی ۱۹۸۹ میں راجستھان کے بارہ میں "ایک خصوصی رپورٹ" نقل کی گئی ہے۔ اس رپورٹ کا پہلا پیراگراف یہ ہے:

"آر ایس ایس، وشو ہندو پریشد اور بھارتیہ جنتا پارٹی نے مل کر گزشتہ پانچ مہینوں سے پورے راجستھان کو فرقہ پرستی کی آگ میں جھونک دیا ہے"۔

یہ "راجستھان کے سترہ اضلاع میں فسادات کی سازش" کے بارہ میں ایک مفصل رپورٹ تھی۔ اس کو پڑھنے کے بعد جب میں ۲۷ جولائی کی شام کو راجستھان جانے کے لئے آشرم اکسپریس پر سوار ہوا تو میں سمجھا کہ میں ایک ایسی دنیا میں جارہا ہوں جہاں ہر طرف آگ کے شعلے مجھے جھلسانے کے لئے بھڑک رہے ہوں گے۔ مگر عجیب بات ہے کہ اردو اخبار کا یہ راجستھان سفر میں نظر نہ آیا۔ مجھے

تو ریاست میں ہر طرف برسات کی ہوائیں چلتی ہوئی نظر آئیں۔ اخبارات (خاص طور پر اردو اور ہندی کے اخبارات) آگ کا کارخانہ ہیں۔ وہ اس تلاش میں رہتے ہیں کہ کہیں کوئی چنگاری ہو تو اس کو بھڑکا کر آتش فشاں بنا دیں۔ جب کہ اللہ یہ چاہتا ہے کہ ٹھنڈی ہوائیں بھیج کر آگ کو بجھا دے۔

میں جس ڈبہ میں تھا، اس میں بظاہر میرے ایک مسافر کے سوا سب کے سب ہندو تھے۔ میں نے اس ڈبہ میں دو وقت کی نماز پڑھی۔ مغرب اور عشاء کی۔ لوگوں نے بہت احترام کے ساتھ نماز کے لئے جگہ خالی کر دی۔ شام کو کھانے کا وقت آیا تو ایک ہندو ہم سفر نے کھانا پیش کیا جس کو میں قبول نہ کر سکا۔ دن کے وقت میں کھڑکی کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا۔ وہاں ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہندو باپ نے بطور خود محسوس کر کے وہاں سے اپنے لڑکے کو ہٹا دیا اور کہا کہ آپ یہاں بیٹھیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ فساد ایک استثناء ہے نہ کہ عمومی واقعہ۔ مگر صحافی اور لیڈر صرف انھیں استثنائی واقعات کو نمایاں کرتے ہیں۔ وہ استثنائی حالت کو عمومی حالت بناتے ہیں۔ وہ "جزیرہ راجستھان" کو پورا راجستھان بنا دیتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے اخبارات کا نام دعوت اور نشیمن رکھا ہے۔ اس کے بجائے اگر وہ اپنے اخبار کا نام عداوت اور خرابات رکھتے تو کم از کم سچ بولنے کا کریڈٹ انھیں ملتا۔ موجودہ حالت میں تو انھیں کوئی بھی کریڈٹ ملنے والا نہیں۔

اس مفصل "رپورٹ" کے آخر میں کہا گیا ہے کہ "فرقہ پرست تنظیمیں اپنے مقاصد میں کامیاب ہو رہی ہیں اور فرقہ وارانہ صورت حال روز بروز بھیانک ہوتی جا رہی ہے" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ قسم کی رپورٹیں اور سازشوں کا انکشاف اور ایڈمنسٹریشن کے نکمے پن کا اعلان اور اجتماعی بیانات کا طریقہ سراسر ناکام ہو چکا ہے۔ اب ہمیں کچھ اور سوچنا ہے۔

رپورٹ میں اس "کچھ اور" کے لئے اشاراتی رہنمائی موجود ہے۔ مثال کے طور پر اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ بھلواڑہ ضلع کے بیگور قصبہ میں ۳۰ مارچ کو فساد کی آگ بھڑکی۔ شیتل اشٹمی کے دن جلوس اپنے روایتی راستہ سے ماکڑ والی مسجد کے سامنے سے گزر رہا تھا، تبھی جلوس کے کسی نے مسجد میں گلال پھینک دیا۔ جس کے جواب میں مسجد کے اندر سے پتھراؤ کیا گیا۔ ۲۱ آدمیوں کو چوٹیں لگیں۔ پولیس کے ۴۰ جوان بھی زخمی ہوئے۔ حالات کو قابو میں کرنے کے لئے پولیس نے آنسو گیس چھوڑے۔ پھر لاٹھی چارج کیا۔ اور ہوائی فائرنگ بھی کی۔ تب جا کر بھیڑ منتشر ہوئی۔ اتنے میں شہریوں

کے محلہ سے کچھ لوگ رامکوٹ بازار میں جلگھسے اور آٹھ دکانوں کو آگ لگادی۔ پانچ مکانوں کو بھی پھونک دیا۔ ۲۰ منٹ تک یہ تباہی و بربادی بلا روک ٹوک چلتی رہی .... صفحہ ۲

اس واقعہ کی روشنی میں فساد کے مسئلہ کا حل یہ ہے کہ "گلال" پھینکنے پر مشتعل ہونے والے لوگ مشتعل نہ ہوں اور وہ مسجد سے پتھر پھینکنے کی دوسری غلطی نہ کریں۔ اس کے بعد فساد اپنے پہلے ہی مرحلہ میں ختم ہو جائے گا۔ مگر دوسری غلطی فساد کو بڑھا دیتی ہے، وہ ایک معمولی واقعہ کو بھیانک حادثہ بنا دیتی ہے۔

راجستھان (قدیم نام راجپوتانہ) کا مطلب ہے راجاؤں کی سرزمین۔ آزادی (۱۹۴۷) سے قبل یہاں چھوٹی بڑی ۲۶ ریاستیں تھیں۔ یہ سب راجپوت تھے جو ہمیشہ سے نہایت بہادر قوم رہے ہیں۔ مغل حکمرانوں کے لئے سب سے بڑا فوجی چیلنج راجپوتوں ہی کی طرف سے تھا۔ اکبر نے اس مسئلہ کے حل کے لئے مصلحت کا انداز اختیار کیا۔ اس کی بعض غیر ضروری حماقتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے راجپوتوں کے سلسلہ میں اس کی پالیسی مفید رہی۔ اس نے راجپوتوں کو اس حد تک اپنے ساتھ لے لیا کہ واحد قابل ذکر راجپوت باغی مہارانا پرتاپ سنگھ کا مقابلہ کرنے کے لئے اکبر کو جو بہترین جنرل ملا وہ راجہ مان سنگھ تھا جو خود بھی ایک بہادر راجپوت تھا۔

آزادی سے قبل ہندستان میں بہت سے راجہ، نواب تھے۔ ان کی ریاستوں کی تعداد ۶۰۱ تک پہنچ گئی تھی۔ ان میں بڑی ریاستیں یہ تھیں: حیدرآباد، کشمیر، میسور، ٹراونکور، بڑودہ، گوالیار، اندور، کوچن، جے پور، جودھپور، بیکانیر، بھوپال اور پٹیالہ۔

راجستھان کی قدیم ریاست جودھپور کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ جودھپور کی تاریخ سے واقف تھے۔ ان سے جو باتیں ہوئیں، اس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

جودھپور کی بنیاد راجہ راؤ جودھا نے ۱۴۵۹ء میں ڈالی تھی۔ انھیں کے نام پر اس کا نام جودھاپور پڑا جو بعد کو جودھپور ہو گیا۔ آزادی سے پہلے یہ ایک راجپوت ریاست تھی۔ جودھپور یونیورسٹی ۱۹۶۲ میں قائم ہوئی۔ جودھپور ضلع کا شمالی اور شمال مغربی حصہ صحرا ہے۔ اس ضلع میں صرف ایک ندی ہے جو لونی کہلاتی ہے۔ اگر آپ شہر کے کنارے کھڑے ہوں تو ایک طرف آپ کو میدانی علاقہ میں شہر کی آبادی پھیلی ہوئی نظر آئے گی۔ دوسری طرف پہاڑی کے اوپر پرانے قلعہ کی عمارتیں دکھائی

دیں گی جو گویا ایک تاریخی مشاہدے کے طور پر بلندی پر کھڑے ہو کر نئے شہر کو دیکھ رہی ہیں۔

جودھپور کے راجہ جسونت سنگھ کی وفات ۱۶۷۸ میں ہوئی۔ اس کے بعد ان کے یہاں فروری ۱۶۷۹ میں ایک لڑکا لاہور میں پیدا ہوا جس کا نام اجیت سنگھ رکھا گیا۔ ایک مورخ نے لکھا ہے کہ جسونت سنگھ کے درباری اجیت سنگھ کو دہلی لے گئے اور مغل شہنشاہ اورنگ زیب سے درخواست کی کہ وہ اس لڑکے کو جسونت سنگھ کی جگہ جودھپور کا راجہ تسلیم کر لے۔ مگر بادشاہ نے کہا کہ اس کو یہاں چھوڑ دو تاکہ اس کی پرورش ہمارے محل میں ہو سکے۔ یا ایک اور معاصر بیان کے مطابق جودھپور کا تخت اجیت سنگھ کو اس شرط پر پیش کیا گیا کہ وہ مسلمان ہو جائے:

The emperor offered to bring him up in his harem, or according to another contemporary account "the throne of Jodhpur was offered to Ajit on condition of his turning a Muslim."

*An Advanced history of India*, p. 495.

ایک اور روایت اس سے بھی آگے جاتی ہے۔ اس کے مطابق مغل تکمراں اورنگ زیب نے ۱۶۷۹ میں مارواڑ کو فتح کیا۔ اس نے حکم دیا کہ اس کے باشندے اسلام قبول کر لیں۔ اس کے جواب میں جودھپور، جے پور اور اودے پور کے راجہ متحد ہو گئے اور مسلم جوئے کو اپنے اوپر سے اتار پھینکا:

The Mughal emperor Aurangzeb invaded and plundered Marwar in 1679, ordering the conversion of its inhabitants to Islam. In reply, the princely states of Jodhpur, Jaipur, and Udaipur formed an alliance and threw off the Muslim yoke.

یہ دونوں روایتیں بالکل بے بنیاد ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ اورنگ کے زمانہ میں جسونت سنگھ راٹھور جودھپور کا راجہ تھا۔ وہ اورنگ زیب کا معتمد تھا۔ حتی کہ اورنگ زیب نے اس کو کابل اور پشاور کا گورنر بنا دیا۔ یہیں ۱۶۷۸ میں جسونت سنگھ کی وفات ہو گئی۔ اس کے بعد فروری ۱۶۷۹ میں اس کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام اس کے گھر والوں نے اجیت سنگھ رکھا۔ جودھپور کے راجپوتوں کی خواہش تھی کہ اورنگ زیب اسی اجیت سنگھ کو جودھپور کا راجہ مان لے۔ مگر اورنگ زیب نے اس درخواست کو منظور نہیں کیا۔ اس کے بجائے اس نے ناگور

کے رانا اندر سنگھ کو جودھپور کے تخت پر بیٹھا دیا۔ اور نوعمر اجیت سنگھ کی بابت اس نے حکم دیا کہ وہ دہلی میں رہے اور مغل ماحول میں تربیت پائے۔

غالباً راجپوتوں نے سمجھا کہ اورنگ زیب اجیت سنگھ کو اپنے یہاں رکھ کر اس کو مسلمان بنانا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ اس کو لے کر دہلی سے بھاگ گئے۔ اس کے بعد انھوں نے اودے پور کے راجہ کے ساتھ مل کر اورنگ زیب کے خلاف بغاوت کر دی۔ حتی کہ خود اورنگ زیب کے لڑکے اکبر کو بھی انھوں نے اس بغاوت میں اپنے ساتھ ملا لیا۔ یہ بے فائدہ لڑائی مختلف صورتوں میں جاری رہی۔ تاہم اورنگ زیب نے اجیت سنگھ کو جودھپور کا راجہ نہیں مانا۔ یہاں تک کہ ۱۷۰۷ میں اورنگ زیب کا انتقال ہو گیا۔

اورنگ زیب کے بعد بہادر شاہ اول نے پالیسی بدل۔ اس نے ۱۷۰۹ میں اجیت سنگھ کو جودھپور کا راجہ مان لیا۔ مگر یہ بعد از وقت تھا۔ چنانچہ دوبارہ اس کا کوئی فائدہ مغل سلطنت کو حاصل نہ ہو سکا۔

اجیت سنگھ کے معاملہ میں اورنگ زیب کا فیصلہ یقیناً غلط تھا۔ اس کے نتیجہ میں وفادار راجپوت غیر ضروری طور پر مغلوں کے دشمن بن گئے۔ اورنگ زیب کو تقریباً ۵۰ سال حکومت کرنے کا موقع ملا۔ اس کے دور کا بیشتر حصہ لڑائیوں میں گزرا۔ یہ لڑائیاں اس کی بہادری کو ثابت کرتی ہیں۔ مگر یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ان لڑائیوں کا کوئی تعلق دانشمندی سے تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اورنگ زیب کی اکثر لڑائیاں صرف اس لئے پیش آئیں کہ وہ "شمشیر" کی طاقت کو ضرور جانتا تھا، مگر حکمت اور دانش مندی کی طاقت کی اسے خبر نہیں تھی۔

اورنگ زیب بلاشبہ مغل خاندان کا ایک بہادر بادشاہ تھا۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ مغل خاندان کا ایک بے دانش بادشاہ تھا۔ یہ اورنگ زیب ہی ہے جس نے اپنی غیر دانش مندانہ کارروائیوں سے مغل سلطنت کے زوال کے اسباب پیدا کئے۔

۲۸ جولائی کی صبح کو فالنا پہنچا۔ یہاں ٹرین چھوڑ دی اور ساتھیوں کے ہمراہ بذریعہ روڈ سفر کر کے شیو گنج پہنچا۔ شیو گنج میں اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں الرسالہ مشن کو پھیلانے کا کام سب سے زیادہ مشتاق احمد صاحب نے کیا ہے۔ وہ الرسالہ مشن کے خاموش

کارکن ہیں اور الرسالہ اور کتابیں لوگوں کو برابر پہنچاتے رہتے ہیں۔

۲۸ جولائی کو جمعہ کا دن تھا۔ نماز جمعہ سے پہلے شیو گنج کی جامع مسجد میں تقریباً پون گھنٹہ کا خطاب ہوا۔ اس کا موضوع یہ حدیث تھی کہ المساجد بیوت المتقین (مسجد متقیوں کا گھر ہے) مختلف پہلوؤں سے اس حدیث رسول کی وضاحت کی گئی۔ اسی دن شام کو ۴ بجے ایک عمومی اجتماع ہوا۔ اس میں ہندو اور مسلم دونوں فرقوں کے لوگ موجود تھے۔ بستی کے معزز ہندوؤں اور ان کے مذہبی پیشواؤں کی بڑی تعداد شریک تھی۔ تقریر کا موضوع "قومی ایکتا" تھا۔ میں نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بتایا کہ ملک میں ایکتا کس طرح قائم کیا جاسکتا ہے۔ ۲۹ جولائی کو جامع مسجد میں نماز عشاء کے بعد ایک خطاب ہوا۔ اس کا موضوع تھا "ایمان و اسلام کی حقیقت"۔

اس کے علاوہ قیام گاہ پر لوگ بڑی تعداد میں برابر آتے رہے۔ اور مجلس کے انداز میں گفتگو اور تفہیم کا سلسلہ جاری رہا۔ شیو گنج کے علاوہ اطراف کی بستیوں سے بھی کچھ لوگ ان مجالس میں شریک ہوئے۔

۲۸ جولائی کو شیو گنج کے اجتماع میں بستی کے جو معزز افراد شریک ہوئے ان میں سے ایک پنڈت کشن لال جی بھی تھے۔

اس سال (۱۹۸۹) شیو گنج میں ایسا ہوا کہ یہاں کے چوک پر جو ہولی کھڑی کی گئی تھی، کسی نے ایک دن پہلے اس میں آگ لگا دی۔ یہ بڑا نازک واقعہ تھا۔ چنانچہ بستی میں تناؤ پیدا ہو گیا۔ اندیشہ ہوا کہ کہیں فرقہ وارانہ فساد نہ ہو جائے۔ اس وقت پنڈت کشن لال جی نے ایک اہم تعمیری کام کیا۔ وہ برہمن ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہولی جل گئی تو کیا ہوا۔ میں دوسری ہولی لگا دیتا ہوں۔ چنانچہ لکڑیاں جمع کر کے دوسری ہولی تیار کی گئی۔ اس کے بعد پنڈت جی نے قاعدہ کے مطابق، منتر وغیرہ پڑھا۔ اس طرح انھوں نے بروقت مداخلت کر کے دوسری ہولی لگوا دی۔ اور اس کے بعد فساد کی فضا اپنے آپ ختم ہو گئی۔

۲۹ جولائی کی شام کو شیر گنج کی جامع مسجد میں مغرب کی نماز پڑھ کر باہر نکلا تو مسجد کی سیڑھیوں پر ہندو عورتیں اپنے بچوں کو لئے ہوئے دعا کے لئے کھڑی ہوئی تھیں۔ یہ منظر پہلے سارے ملک کی مسجدوں میں دکھائی دیتا تھا۔ اب وہ بہت کم ہو گیا ہے۔ یہ اس عزت و احترام

کی ایک علامت ہے جو ماضی میں مسلمانوں کے لئے ہندوؤں کے دلوں میں پایا جاتا تھا۔

اس پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ ہندستان میں مسلم تاریخ کے دو دور ہیں۔ ایک "۱۹۴۷" سے پہلے کا دور، دوسرا ۱۹۴۷ کے بعد کا دور۔ قدیم دور میں ہمارے معاشرہ پر صوفیاء کا غلبہ تھا۔ موجودہ زمانہ میں ہمارے معاشرہ پر لیڈروں کا غلبہ ہے۔ صوفیاء محبت کی باتیں کرتے تھے، اس کے مقابلہ میں لیڈروں کا حال یہ ہے کہ وہ نفرت کی باتیں کرتے ہیں۔ صوفیاء کے زمانہ میں ہندوؤں کی نظر میں مسلمانوں کی تصویر ایک قابل احترام گروہ کی تھی۔ لیڈروں کے زمانہ میں معاملہ اس کے برعکس ہوگیا ہے۔ اب ہندوؤں کی نظر میں مسلمانوں کی تصویر ایک قابل حقارت گروہ کی ہوگئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تمام مصیبتوں کے واحد ذمہ دار ان کے نام نہاد لیڈر ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کو حدیث میں الائمۃ المضلون کہا گیا ہے۔ لیڈروں کی جھوٹی لیڈری نے خود ان کی ذات کو تو یقیناً فائدہ پہنچایا ہے مگر قوم کو صرف بربادی کے گڑھے میں ڈال دیا ہے۔ جس دن مسلمان اپنے ان جھوٹے رہنماؤں سے نجات حاصل کرلیں گے، اسی دن ان کے مستقبل کی صبح بھی طلوع ہو جائے گی۔

ایک صاحب نے بتایا کہ میرے چار لڑکے ہیں۔ چاروں آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔ میں ان کی طرف سے سخت پریشان ہوں۔ میں نے چاروں لڑکوں کو جمع کرکے انھیں سمجھایا۔ پھر ان کی رضامندی سے ایک تحریر تیار کی۔ اس میں لکھا تھا کہ "ہم چاروں بھائی آج ۲۹ جولائی ۱۹۸۹ کو یہ پکا وعدہ کرتے ہیں کہ ہم اپنے بڑے بھائی کو اپنا سردار مانیں گے۔ ساری زندگی ان کے کہے پر چلیں گے، خواہ ہم کو پسند ہو یا ناپسند" اس تحریر پر چاروں بھائیوں نے دستخط کئے۔

میں نے کہا کہ اتحاد اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص کو غیر مشروط طور پر بڑا بنایا جائے۔ پھر ان کو سمجھایا کہ بڑے کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ چھوٹوں کے ساتھ محبت کے ساتھ پیش آئے۔ اور چھوٹوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے بڑے کا احترام کریں۔ اللہ تعالیٰ ان نوجوانوں کی مدد فرمائے۔

شیوگنج میں ایک صاحب نے اپنے یہاں کھانے پر بلایا۔ میں نے ان کا نام پوچھا تو انھوں نے بفات شریف (۷۰ سال) بتایا۔ وہ "بارہ وفات" کو پیدا ہوئے تھے، اس لئے ان کا

نام لفات شریف یا وفات شریف رکھ دیا گیا۔ وہ بہت معمولی پڑھے لکھے تھے۔ وہ الرسالہ جیسی کسی تحریر کا مطالعہ نہیں کر سکتے۔ اور نہ کبھی انھوں نے میرا نام سنا تھا۔ ان کی شخصیت کا اندازہ کرنے کے لئے صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ جب وہ مجھ کو اپنے گھر لے گئے اور دسترخوان پر کھانا رکھا گیا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ "پہلے فاتحہ دے دیجئے"۔ مجھے حیرانی کے عالم میں دیکھ کر میرے ایک ساتھی نے مدد کی۔ انھوں نے ہاتھ اٹھا کر "فاتحہ پڑھا" اور اس کے بعد کھانا شروع ہوا۔

میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے ۱۹۴۷ سے پہلے کا زمانہ بھی دیکھا ہے اور ۱۹۴۷ کے بعد کا زمانہ بھی۔ یہ بتائیے کہ آج کے مقابلہ میں پہلے کا زمانہ کیسا تھا۔ انھوں نے راجستھانی زبان میں کہا: "بات چیت اور ڈھنگ اچھو تھو۔ ہر ایک اجت سے بلاوتا"۔ انھوں نے بتایا کہ پہلے زمانہ میں ہندو مسلم جھگڑے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ سب بھائی چارہ کے ساتھ رہتے تھے۔ یہ صرف موجودہ زمانہ کی بات ہے کہ ہر معاملہ میں ہندو مسلم، ہندو مسلم ہونے لگا ہے۔

میں نے سوچا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے جب راجستھان (راجپوتانہ) جیسی ہندو ریاست کا یہ حال تھا کہ ہندو مسلمان مل جل کر رہتے تھے۔ ہر ایک دوسرے کو عزت کے ساتھ بلاتا تھا تو وہ "ہندو ہندستان" کہاں تھا جس کا ہوا کھڑا کر کے تقسیم پسند لیڈروں نے تمام مسلمانوں کو ورغلایا۔ وہ ہندو ہندستان نام نہاد لیڈروں کے اپنے خود ساختہ دماغوں میں تھا۔ چھوٹے چھوٹے معمولی واقعات کو مبالغہ اور تعمیم کے ساتھ پیش کر کے انھوں نے عام مسلمانوں کو بھڑکا دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ تمام بگاڑ تقسیم کی سیاست کا نتیجہ ہے۔ مسلم لیڈروں نے دو قومی تحریک ہندو مسلم مسئلہ ختم کرنے کے لئے اٹھائی تھی۔ مگر ان کی نام نہاد تحریک نے ہندو مسلم مسئلہ کو ہزار گنا زیادہ بڑھا دیا۔ شیو گنج قدیم سروہی ریاست کا حصہ تھا۔ اس ریاست کے والی مہاراجہ سر سروپ رام سنگھ تھے۔ وہ بہت نیک نفس آدمی تھے۔ آخر عمر میں انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ۲۳ جنوری ۱۹۴۶ کو دہلی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ دہلی میں وہ ۲۴-۲۶ علی پور روڈ پر رہتے تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد مہاراجہ نے اپنا نام محمد عمر رکھا تھا۔

مہاراجہ کی بیوی نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا اور اپنا نام سعید النساء رکھا تھا۔ ان کی ایک ذاتی زمین (۶۰ بیگھہ) شیو گنج میں تھی۔ اس زمین کو انھوں نے مہاراجہ کی زندگی ہی میں ۱۸ جون

۱۹۴۵ کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام وقف کر دیا۔ یہ وصیت نامہ ۹۷۸ روپیہ کے اسٹمپ پر ہے۔ وہ اردو میں ہے اور اس پر سابق جارج پنجم کی تصویر بنی ہوئی ہے۔

اس وقف نامہ کی فوٹو کاپی میں نے یہاں دیکھی۔ اس میں درج ہے کہ اس وقف سے سرو ہی اور راجستھان کے مسلم نوجوانوں، نیز دوسرے مسلمانوں کی تعلیمی امداد کی جائے۔ وقف نامہ کے مسودہ میں مزید یہ درج ہے کہ "یونیورسٹی مذکور کو یہ بھی اختیار ہوگا کہ جائداد موقوفہ کے جز، یا کل کو فروخت کرکے اس کے حاصل سے دیگر جائداد جس مقام پر چاہے خرید لے۔ اور جو جائداد اس طرح خرید کی جائے وہ اس وقف کی مستذکرہ مد میں خرچ کی جائے۔"

اس موقوفہ جائداد کو میں نے خود دیکھا۔ اس وقت وہ کروروں روپیہ کی مالیت رکھتی ہے۔ مگر یہ قیمتی زمین ۴۵ سال سے بالکل بے کار پڑی ہوئی ہے۔ فاصلہ کی وجہ سے یونیورسٹی اگر اس کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی تو وقف کے مطابق وہ اس کو فروخت کرکے دوسرا موزوں انتظام کر سکتی ہے۔ مگر یونیورسٹی کے ذمہ داران نے اب تک یہ بھی نہیں کیا۔ شاید اندرونی جھگڑوں کی وجہ سے انھیں یہ موقع نہیں کہ وہ یونیورسٹی کے بیرونی مسائل کی طرف "توجہ دے سکیں۔

مولانا خدا بخش بلوچ (۳۵ سال) اپنے الفاظ میں، الرسالہ کے شیدائی ہیں۔ ہر شمارہ کو کئی کئی بار پڑھتے ہیں۔ انھوں نے اپنا ایک ذاتی واقعہ بتایا۔ ہیڈگواڑ جنم شتابدی (فروری ۱۹۸۹) کے موقع پر شیوگنج میں ہندو نوجوانوں کا ایک جلوس نکلا۔ وہ چلتا ہوا جامع مسجد کے سامنے پہنچا جس میں مولانا خدا بخش صاحب امام اور خطیب ہیں۔ جلوس اس وقت مختلف قسم کے اشتعال انگیز نعرے لگا رہا تھا۔ مثلاً "جس کو چاہئے پاکستان، اس کو بھیجو قبرستان" اور "بھارت میں رہنا ہوگا، وندے ماترم کہنا ہوگا" وغیرہ۔

مولانا خدا بخش صاحب اس وقت مسجد میں تھے۔ وہ شور سن کر باہر آئے۔ انھوں نے کسی بھی قسم کا غصہ یا ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ حتی کہ یہ بھی نہیں پوچھا کہ تم لوگ کیا نعرے لگا رہے ہو۔ اس کے بجائے انھوں نے یہ کیا کہ مجمع پر نظر ڈالی۔ چند نوجوان انھیں اپنی پہچان کے نظر آئے۔ انھوں نے لپک کر ان سے آداب کیا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دئے۔ یہ دیکھ کر جلوس کے دوسرے لوگ بھی "مولوی صاحب نمستے، مولوی صاحب نمستے" کرنے لگے۔ مخالفانہ نعرہ بازی موافقانہ ملاقات میں تبدیل ہوگئی۔

ان سے میں نے پوچھا کہ اس پوری کارروائی میں آپ کا کتنا وقت لگا۔ انھوں نے کہا کہ صرف پانچ منٹ۔

مولانا خدا بخش جب یہاں کی مسجد میں آئے تو ایک شخص سے ان کی دلچسپ گفتگو ہوئی۔ ان کی روایت کے مطابق یہ گفتگو حسب ذیل تھی:

"مولانا، آپ دیوبندی ہیں یا بریلوی"

"بھائی میں تو راجستھانی ہوں"

"نہیں، میں عقیدہ کی بات کر رہا ہوں"

"عقیدہ کوئی مکانی چیز نہیں۔ اگر مکان کی نسبت سے عقیدہ بنتا تو مکی عقیدہ اور مدنی عقیدہ کہا جاتا" اس کے بعد گفتگو اپنے آپ ختم ہوگئی۔

میں شیو گنج میں مشتاق احمد صاحب (۵۶ سال) کے ساتھ مقیم تھا۔ انھوں نے بتایا کہ شیو گنج میں ہماری مسجد کی دیوار پر کسی نے ہندی میں نعرے لکھ دئے "ہندو جاگے گا، دیش جاگے گا" "دیش کے لئے جینا سیکھو" وغیرہ۔ ان نعروں پر غصہ کا اظہار کرنے کے بجائے انھوں نے اس کو پانی سے دھوڈالا۔ اس کے بعد سالانہ موقع پر مسجد میں سفیدی ہوئی اور قصہ ختم ہوگیا — اس دنیا میں ہر برائی کو ختم کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ آپ کے اندر یہ حوصلہ ہو کہ آپ لوگوں کی سیاہی کے اوپر اپنی طرف سے سفیدی پھیر دیا کریں۔

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ اس ملک کے ہندو اور مسلمان آج اپنے اپنے مذہب پر نہیں ہیں بلکہ انگریز کے دئے ہوئے مذہب پر ہیں۔ انگریز نے اپنے مقصد کی خاطر یہاں "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی چلائی۔ اس نے مذہب کو محبت کے بجائے نفرت کا عنوان بنا دیا۔

میں نے اپنے بچپن میں دیکھا ہے کہ ریلوے اسٹیشنوں پر ہندو پانی اور مسلم پانی کے الگ الگ برتن ہوا کرتے تھے۔ یہ رجحان بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچا کہ ہر معاملہ میں ہندو مسلم، ہندو مسلم کیا جانے لگا۔ مثال کے طور پر کسی اسکول کا نام ہندو اسکول یا کسی کالج کا نام ہندو کالج تھا، یا وہاں ہندو ٹیچر بچوں کو پڑھاتے تو مسلمان وہاں داخلہ لینا پسند نہیں کرتے تھے۔

اس طرح کی تقسیم سراسر احمقانہ تھی۔ حتی کہ وہ خود سنت رسول کے خلاف تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے نازک سفر کے لئے ایک مشرک عبد اللہ بن ارقط کو اپنا رہنما بنایا۔ اسلام

کا پہلا مدرسہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قائم ہوا، اس کے تمام کے تمام ٹیچر مشرک بلکہ دشمن اسلام تھے۔ یہ مدرسہ وہ تھا جو مدینہ میں بدر کے مشرک قیدیوں کے ذریعہ قائم کیا گیا۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ صحیح حدیث کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجھے یونس بن متی پر فضیلت نہ دو (لا تفضلونی علیٰ یونس بن متی) مگر تمام مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو افضل الانبیاء کہتے ہیں۔ شارحین حدیث نے اس اشکال کے جوابات دئے ہیں لیکن ان سے میری تسلی نہ ہو سکی۔

میں نے کہا کہ دو باتیں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ایک ہے باعتبار حقیقت کسی پیغمبر کا دوسرے پیغمبروں سے افضل ہونا۔ اور دوسرا ہے، ایک پیغمبر کو دوسرے پیغمبروں پر افضل بتانا۔ اس حدیث میں افضل ہونے کی تردید نہیں ہے بلکہ افضل بتانے کی تردید ہے۔ علم الٰہی میں یقیناً پیغمبروں کے درجات ہیں۔ مگر ہمارا کام اتباع رسول ہے نہ کہ تفضیل انبیاء کی بحث چھیڑنا اور اس پر تقریر کرنا۔

سمیرپور پالی بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ کاروبار کے اعتبار سے یہ شیوگنج سے بڑا ہے۔ حکومت نے حال ہی میں یہاں بہت بڑی منڈی نئے طرز کی تعمیر کرائی ہے۔ یہ زرعی پیداوار کی منڈی ہے اس کی کشادہ سڑکوں پر جگہ جگہ کبوتروں کے غول بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ غلّہ اتارتے اور چڑھاتے ہوئے اس کے دانے سڑک پر گرتے ہیں۔ ان کو کھانے کے لئے یہ کبوتر یہاں جمع رہتے ہیں۔ وہ اپنے عمل میں اتنے منہمک تھے کہ جب تک ہماری گاڑی کے پہیے ان کے سر تک نہ پہنچ جاتے، وہ وہاں سے نہ اڑتے۔

سمیرپور کی سڑکوں اور بازاروں سے چلتے ہوئے یہی منظر وہاں کے انسانوں کا بھی نظر آیا۔ ہر آدمی انتہائی یکسوئی سے اپنے کاروبار میں مشغول تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کو کاروبار کے سوا کسی اور چیز کی طرف دیکھنے کی بھی فرصت نہیں ہے۔

میں نے سوچا کہ جب یہ لوگ کاروبار میں اتنا زیادہ منہمک ہیں تو آخر وہ کون ہے جو فرقہ وارانہ دنگے اور فساد کرتا ہے۔ میری سمجھ میں آیا کہ دنگا اور فساد کرنے والے یہ لوگ نہیں ہیں۔ بلکہ یہ دراصل چھوٹے طبقہ کے لوگ ہیں جو دنگا اور فساد کرتے ہیں۔ بقیہ لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ ان کے فرقہ کے

چھوٹے لوگ جب فساد کرتے ہیں تو وہ ان کی مذمت نہیں کرتے، اس طرح ان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ یہ خاموشی حوصلہ افزائی فساد کو جاری رکھتی ہے۔ اگر وہ اپنے فرقہ کے فسادیوں کی مذمت کریں تو ان کی حوصلہ شکنی ہو اور فساد کی جڑ کٹ جائے۔

مگر یہاں "ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند" والا معاملہ ہے۔ مسلمانوں کا حال بھی یہی ہے۔ کہ ان کے "خوش پوش" لوگ خود کبھی فساد میں شریک نہیں ہوتے۔ جو مسلمان فساد چھیڑتے ہیں یا فساد کے اسباب پیدا کرتے ہیں وہ ہمیشہ مسلمانوں کے نچلے طبقہ سے تعلق رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ مگر یہاں بھی مسلمانوں کا خوش پوش طبقہ یہی جرم کرتا ہے کہ وہ ان غلط کار مسلمانوں کی مذمت نہیں کرتا۔ مثلاً ایک مقام پر ہندوؤں کے جلوس میں سے کسی شخص نے مسجد کی دیوار پر گلال پھینک دیا تو کچھ مسلمانوں نے جلوس کے اوپر پتھراؤ کیا۔ اس سے فساد برپا ہو گیا۔ ایک مقام پر ایک آدمی واسی لڑکی کے ساتھ ایک مسلمان ملوث پایا گیا۔ اس کے نتیجہ میں فساد ہو گیا۔ مگر ان مواقع پر مسلمانوں کے نمائندہ طبقہ نے اپنے فرقہ کے غلط کار افراد کی مذمت نہیں کی۔ وہ یا تو ایڈمنسٹریشن کو برا کہتے رہے یا ہندو فرقہ پرستوں کو۔

یہی صورت حال فساد کی جڑ ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں فرقہ کے اعلیٰ طبقہ کو یہ ڈر رہتا ہے کہ اگر وہ اپنے فرقہ کے غلط کار افراد کی مذمت کریں گے تو وہ اپنی قوم سے کٹ جائیں گے ــــ آدمی اپنی قوم سے نہ کٹنے کے لیے حق سے کٹ جاتا ہے۔

ایک صاحب نے پالی (راجستھان) کا واقعہ بتایا۔ ایک مسلم نوجوان چوڑی کے اوزار کا کاریگر بننا چاہتا تھا۔ یہ اوزار لوہے کے ہوتے ہیں۔ نوجوان اوزار بنانا سیکھنا چاہتا تھا مگر استاد لوگوں نے اس کی مدد نہیں کی۔ نوجوان پریشان ہوا کہ استاد کے بغیر اوزار بنانا کس طرح سیکھے۔ آخر اس نے منت مانی۔ اس نے کہا کہ اگر مجھ کو اوزار بنانا آجائے تو میں چاندی کا اوزار بنا کر تعزیہ پر چڑھاؤں گا۔

اس منت کے بعد اس نے کوشش شروع کر دی۔ یہاں تک کہ استاد کے بغیر اس نے اوزار بنانا سیکھ لیا۔ اس نے پہلا اوزار چاندی کا بنا کر اس کو تعزیہ پر چڑھایا۔ یہ دو سال پہلے کا واقعہ ہے۔

(باقی آئندہ)

## خبرنامہ اسلامی مرکز — ۵۶

۱- پانچ جنیہ ہندی کا مشہور ہفتہ وار پرچہ ہے۔ اس کے نمائندہ مسٹر موکیش کوشک ۸ ستمبر ۱۹۸۹ کو مرکز میں آئے اور اپنے پرچہ کے لیے صدر اسلامی کا مفصل انٹرویو لیا۔ سوالات زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے مسائل اور مسلم لیڈرشپ کے بارہ میں تھے۔

۲- مدینہ ایجوکیشن سنٹر، پبلک اسکول، جونیر بوائز کالجس و ہاسٹل، حیدرآباد کی جانب سے ایک مضمون "ذرا غور کیجئے" کے عنوان سے مختلف اخبارات میں شائع کیا گیا ہے۔ وہ مضمون یہ ہے: "مرکز اسلامی ہند نے، اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت کے مقصد کے تحت، حمایت نگر حیدرآباد میں دو منزلہ عمارت خرید کر اس کی ذمہ داری ایک مولانا کو سونپ دی تھی۔ مگر ہائے افسوس وہی مولانا، اشاعتی کاموں کو ٹھپ اور عمارت میں قانونی پیچیدگیاں پیدا کر کے پہلی منزل پر خود مولانا کا قیام اور نچلی منزل میں شراب کا گودام، اور اکابرین خاموش"۔ یہ مضمون حسب ذیل انگریزی اور اردو اخبارات میں شائع ہوا ہے ــــ دکن کرانیکل، سکندرآباد، ۳ ستمبر ۱۹۸۹۔ منصف، حیدرآباد، ۲ ستمبر ۱۹۸۹ رہنمائے دکن ویکلی، حیدرآباد، ۴ — ۱۰ ستمبر ۱۹۸۹۔

۳- قطر (عرب امارات) سے عمر اسماعیل صاحب لکھتے ہیں: آپ کا رسالہ کچھ ماہ پہلے نظروں سے گزرا۔ میری ۴۵ سالہ زندگی میں پہلی بار محسوس کیا کہ اسلامی لٹریچر میں پڑھنے جیسی کوئی چیز ہے۔ ورنہ مولاناؤں کے اسلام نے کم سے کم مجھے بغاوت پر اتروایا۔ میں اپنی زندگی کے دس سال غیر مسلموں کے ماحول میں بتا چکا تھا جہاں ہر غیر مسلم مجھے مسلم سے اچھا لگا، بھلا لگا۔ اور آہستہ آہستہ میرے خیالات اور جذبات ہر مسلم ملا کے خلاف ہوتے گیے۔ اللہ کا شکر ہے کہ آپ کا رسالہ نظروں سے گزرا اور آپ حضرات کی ہستی نے مجھے کفر کرتے کرتے بچا دیا۔

۴- نئی دہلی (انڈیا انٹرنیشنل سنٹر) میں ٹائمس آف انڈیا گروپ کی طرف سے "آنکھ کا عطیہ اور مذہب" کے موضوع پر سیمنار ہوا تھا۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے ایک پیپر پیش کیا جس کا عنوان تھا:

(Eye Donation and Islam)

ٹائمس آف انڈیا ۷ ستمبر ۱۹۸۹ (صفحہ ۳) پر اس کی مفصل رپورٹ شائع ہوئی۔ اس میں سب سے زیادہ کوریج صدر اسلامی مرکز کی تقریر کو دیا گیا ہے۔ اس سیمنار میں مختلف مذاہب کے چالیس اہل علم اور اسکالر شریک ہوئے تھے۔ یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلم علماء اگر ایسے اجتماعات میں شریک ہوں تو اس سے اسلامی دعوت کو کتنا زیادہ فائدہ ہو۔ مگر موجودہ صورت حال یہ ہے کہ سارے ملک میں کوئی بھی عالم نہیں جو مشترک اجتماعات یا مختلف مذاہب کانفرنسوں میں شرکت کرتا ہو۔ صدر اسلامی مرکز تنہا عالم ہیں جو ہندستان اور ہندستان کے باہر اس قسم کے مواقع پر شرکت کرتے ہیں اور بین مذاہب اجتماعات میں اسلامی دعوت پیش کر رہے ہیں۔

۵۔ مرکز کی دو کتابیں، سچا راستہ اور دینی تعلیم اس سے پہلے تلگو زبان میں شائع کی گئی تھیں۔ اب "سچا راستہ" کا تلگو ترجمہ دوبارہ زیادہ اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ اس کو حاصل کرنے کا پتہ یہ ہے:

الرسالہ اکیڈمی، ۲/۱۹/۷۸۰-۵-۳، اعظم منزل، کنگ کوٹھی، حیدرآباد

۶۔ جناب ولی محمد صاحب انصاری (دھولیہ) نے جینت بابوراؤ شمپی صاحب کو انگریزی کتاب گاڈ ارائزز پڑھنے کے لیے دی۔ جناب شمپی صاحب کو پڑھنے کے بعد یہ کتاب پسند آئی اور انھوں نے مرہٹی زبان میں اس کا ترجمہ کرنے کی پیش کش کی۔ چنانچہ اب انھوں نے پوری کتاب کا مرہٹی ترجمہ مکمل کر لیا ہے۔ جناب جینت بابوراؤ شمپی صاحب نے یہ پورا ترجمہ رضا کارانہ طور پر کیا ہے۔

ہندستان سے مسلم قانون دانوں کا ایک وفد ماریشش گیا جو وہاں کی سپریم کورٹ میں مسلم پرسنل لا کے ایک مقدمہ میں مسلمانوں کی طرف سے بیان اور شہادت دے۔ یہ ساعت اکتوبر ۱۹۸۹ کے پہلے ہفتہ میں ہوئی۔ اس وفد میں انگریزی داں عالم کی حیثیت سے صدر اسلامی مرکز کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ مگر انھیں دنوں ایک اور بیرونی سفر پیش آنے کی وجہ سے موصوف اس وفد میں شرکت کی دعوت قبول نہ کر سکے۔

۸۔ ایک صاحب لکھتے ہیں : ماہ نومبر ۱۹۸۸ میں پہلی بار خاتون اسلام نظر سے گزری۔ اس سے کافی قبل الرسالہ کے ذریعہ آپ کا تعارف ہو چکا تھا۔ چوں کہ دین کی طرف دل چسپی کم تھی۔ اس لیے پہلے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ خاتونِ اسلام کے پڑھنے کے بعد آپ کے لٹریچر پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ خاتونِ اسلام کے بعد پرانے رسالوں کا مطالعہ شروع کیا۔ میرا شوق دن بدن بڑھتا گیا۔ جیوں جیوں مطالعہ کرتا تیوں تیوں آپ سے ملنے کی خواہش بڑھتی گئی۔ اور ساتھ ساتھ یہ خواہش تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو الرسالہ کے ذریعہ آپ کا تعارف کراؤں جب میں دعوت دیتا تھا تو کئی پڑھے لکھے لوگوں نے کہا کہ مولانا مسلمانوں کو بزدلی سکھلاتے ہیں۔ میری کم علمی یا کم عقلی سمجھیے کہ میں بھی اس مرض کا شکار ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ شکر ہے کہ ۲۵ مئی کو آپ سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ نے میری غلط فہمی کو دور کیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ آپ کی کتاب "حل یہاں ہے" پڑھنے کا مشورہ دیا۔ جس کا میں بہت مشکور ہوں۔ میں مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ آپ جو کچھ پیش کرتے ہیں قرآن اور حدیث کی روشنی میں پیش کرتے ہیں پھر بھی بہت سے لوگ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ میرے خیال میں لوگ سنی سنائی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں، اور میری طرح اس قسم کے لوگ آپ کے لٹریچر کے مطالعہ سے کورے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ حق کی بات کرنے والوں کی ہمیشہ مخالفت کی گئی ہے اور یہ سلسلہ قیامت تک چلتا رہے گا۔ حق ہمیشہ باطل پر غالب رہا ہے اور رہے گا۔ (حمید اللہ خاں، کلکتہ)

۹۔ ایک صاحب لکھتے ہیں : ماہنامہ الرسالہ ہمارے یہاں آتا ہے۔ میں برابر اس کو پڑھتا ہوں۔ ہر ماہ الرسالہ کا بے چینی کے ساتھ انتظار رہتا ہے۔ ماشاء اللہ بہت اچھا رسالہ ہے۔ میرے پاس جب دو چار الرسالہ جمع ہو جاتے ہیں تو ان کو میں جناب ابراہیم یوسف باوا کو انگلینڈ بھیج دیتا ہوں۔ باوا صاحب انگلینڈ میں رہتے ہیں اور وہاں ادارہ اشاعت الاسلام کے نام سے ایک ادارہ چلاتے ہیں۔ باوا صاحب نے اپنے خط میں الرسالہ کی ہر لحاظ سے کافی تعریف کی ہے۔ (سید مجیب الرحمٰن، دہلی)

# ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

## ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

## زر تعاون الرسالہ

| | |
|---|---|
| زر تعاون سالانہ | ۶۰ روپیہ |
| خصوصی تعاون سالانہ | ۳۰۰ روپیہ |
| **بیرونی ممالک سے** | |
| ہوائی ڈاک | ۲۵ ڈالر امریکی |
| بحری ڈاک | ۱۵ ڈالر امریکی |

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

# ISLAM

## In Contemporary Language

AL-RISALA monthly has a two-fold aim: first, to introduce Islam as a divine message; second, to promote positive and constructive thinking among the people. It is published in Urdu and English by the Islamic Centre, New Delhi.

To receive your copies of this thought-provoking magazine regularly, subscribe NOW.

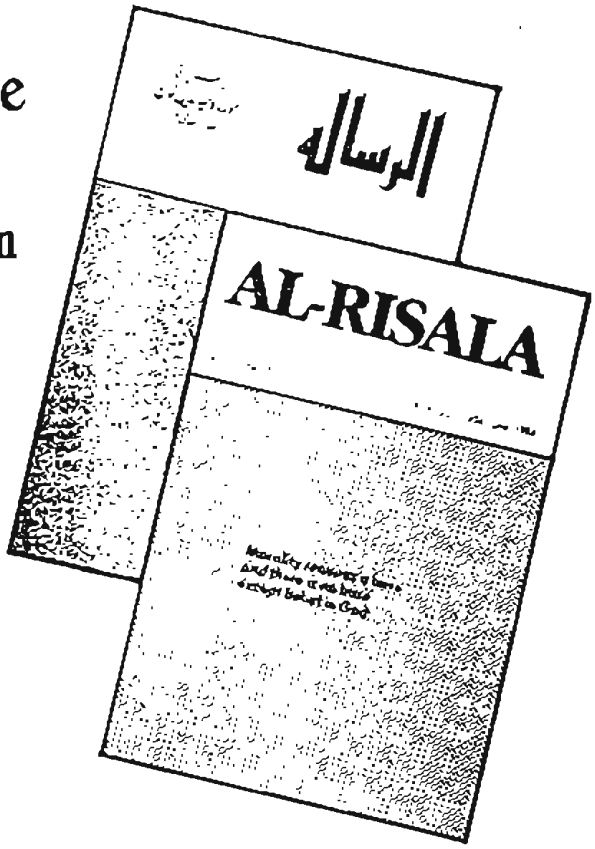


*Ask for a free sample copy.*

---

Please send AL-RISALA to me/my friend/relative at the following address:

Name: _____

Address: _____

_____

_____

_____

Please send a free sample copy of AL-RISALA at the following address:

_____

_____

_____

(Please use a separate sheet for more than one address)

☑ Please send a publications catalogue

Please tick box where applicable

☐ Urdu ☐ 1 year ☐ 3 years
☐ English ☐ 2 years ☐ 5 years
☐ Air-mail ☐ Surface-mail

I am enclosing Cheques/Bank Draft/ Postal Order/M.O. Receipt No. _____

**Subscription Rates**

| INLAND | ABROAD AIRMAIL | ABROAD SURFACE MAIL |
|---|---|---|
| 1 year Rs 60 | Rs 400/$25/£15 | Rs 200/$15/£8 |
| 2 years Rs 110 | Rs 700/$45/£25 | Rs 350/$25/£15 |
| 3 years Rs 150 | Rs 1000/$65/£40 | Rs 500/$35/£20 |
| 5 years Rs 240 | Rs 1500/$100/£60 | Rs 750/$55/£30 |

Pakistan Rs 150 for one year

Supporting Subscription (For One Year)

INLAND ..... Rs 300
ABROAD (By Air-mail) ..... $100/£80

Please send this together with the payment to the Circulation Manager.

AL-RISALA The Islamic Centre, C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013 (India)

Delhi Postal Regd. No D(SE) 243 ☐ RNI 28822/76 ☐ November 1989 No 156 ☐ Rs. 5


# عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

## مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

| | Rs |
|---|---|
| تذکیر القرآن جلد اول | 125/- |
| 〃 〃 جلد دوم | 125/- |
| اللہ اکبر | 40/- |
| پیغمبر انقلاب | 30/- |
| مذہب اور جدید چیلنج | 35/- |
| عظمتِ قرآن | 25/- |
| دین کامل | 40/- |
| الاسلام | 30/- |
| ظہورِ اسلام | 30/- |
| اسلامی زندگی | 25/- |
| احیاءِ اسلام | 20/- |
| رازِ حیات (مجلد) | 50/- |
| صراطِ مستقیم | 30/- |
| خاتونِ اسلام | 35/- |
| سوشلزم اور اسلام | 30/- |
| اسلام اور عصرِ حاضر | 25/- |
| حقیقتِ حج | 25/- |
| اسلامی تعلیمات | 25/- |
| اسلام دورِ جدید کا خالق | 15/- |
| رشدیات | |
| تعمیر کی طرف | 6/- |
| تبلیغی تحریک | 15/- |
| میوات کا سفر | 30/- |
| اقوالِ حکمت | 15/- |
| تعبیر کی غلطی | 40/- |
| دین کی سیاسی تعبیر | 12/- |
| دین کیا ہے | 3/- |
| قرآن کا مطلوب انسان | 7/- |
| تجدیدِ دین | |
| اسلام دینِ فطرت | 5/- |
| تعمیرِ ملت | 5/- |
| تاریخ کا سبق | 5/- |
| مذہب اور سائنس | 8/- |
| عقلیاتِ اسلام | 5/- |
| فسادات کا مسئلہ | 4/- |
| انسان اپنے آپ کو پہچان | 3/- |
| تعارفِ اسلام | 4/- |
| اسلام پندرھویں صدی میں | 4/- |
| راہیں بند نہیں | 5/- |
| ایمانی طاقت | 5/- |
| اتحادِ ملت | 5/- |
| سبق آموز واقعات | 5/- |
| زلزلۂ قیامت | 6/- |
| حقیقت کی تلاش | 4/- |
| پیغمبر اسلام | 4/- |
| آخری سفر | 5/- |
| اسلامی دعوت | 5/- |
| خدا اور انسان | 5/- |
| حل یہاں ہے | 6/- |
| سچا راستہ | 3/- |
| دینی تعلیم | 5/- |
| حیاتِ طیبہ | 4/- |
| باغِ جنت | 5/- |
| نارِ جہنم | 5/- |

| | |
|---|---|
| God Arises | Rs. 55/- |
| Muhammad The Prophet of Revolution | 60/- |
| Religion and Science | 25/- |
| Tabligh Movement | 20/- |
| The Way to Find God | 5/- |
| The Teachings of Islam | 8/- |
| The Good Life | 7/- |
| The Garden of Paradise | 7/- |
| One Fire of Hell | 7/- |
| Muhammad The Ideal Character | 4/- |
| Man Know Thyself ! | 4/- |
| इन्सान अपने आपको पहचान | 3/- |
| सच्चाई की तलाश | 5/- |

## مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی